عائشہ خان

گھر ہونے تک ۔۔۔۔۔ عائشہ خان

ثمین نے رشک بھری نظروں سے سارہ شاہ کو دیکھا تھا۔ کٹ دانے کے کام سے آراستہ ملٹی شیڈ ڈ پلوؤں والی گہرے نیلے رنگ کی ساڑھی میں اس کا مرمریں سراپا اور شہابی رنگت والا دلکش چہرہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہا تھا گو کہ ان کی عمروں میں صرف دس دن کا فرق تھا اور یہ دس دن بھی سارہ شاہ ثمین سے بڑی تھی لیکن اپنے بے حد نازک سراپا اور بچوں کی سی نرم وملائم جلد کی وجہ سے لگتی اس سے دس سال چھوٹی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی سارہ۔۔۔۔۔! تیار ہونے کے بعد تم نے جانے کا پروگرام بدل دیا۔ کیوں۔۔۔۔۔؟" ثمین حیران ہوئی حالانکہ غلط حیران تھی۔ اب تک اسے اپنے بچپن کی دوست اور اکلوتی نند کے شاہانہ مزاج کو سمجھ جانا چاہیے تھا۔

"بس موڈ نہیں رہا۔۔۔۔۔" اس نے ائیر رنگز اتارتے ہوئے کہا۔

"افوہ! ایک تو یہ تمہارے موڈ کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا اور گھر پر بھلا کیا کرو گی؟"

"گھر پر۔۔۔۔۔!" وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔

"بور ہوگی خوب۔۔۔۔۔ چلی چلو۔۔۔۔۔" ثمین نے گویا اسے ڈرایا۔ اپنی تمام تر خود سری اور خود پسندی کے باوجود وہ اسے بے حد عزیز تھی اور بقول بہروز ہاشمی کے، یہ ایک تاریخی واقعہ تھا کہ کوئی بھابھی نند سے اس قدر محبت کرتی ہے۔

"نہیں ثمین! میں نہیں جا رہی۔ تم شاہا سے میری طرف سے معذرت کر لینا۔" اس نے کہا تھا اور ثمین اسے خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئی، لیکن ابھی چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ آگے آگے وہ اور پیچھے بہروز ہاشمی اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔

"سارہ! ثمین بتا رہی ہے تم شاہا کی برتھ ڈے پارٹی میں نہیں جا رہی، تم ٹھیک تو ہو۔۔۔۔۔؟" بہروز ہاشمی نے فکر مندی سے پوچھا۔

"ہاں بھائی! ایک دم ٹھیک۔" بھائی کی محبت پر وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

"پھر۔۔۔۔۔؟" بہروز ہاشمی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"بس یوں ہی بھائی! دل نہیں چاہ رہا جانے کو۔۔۔۔۔"

"میں انہیں کہہ رہی تھی آپ کی موڈی بہن کا موڈ نہیں ہے جانے کا اور کوئی بات نہیں ہے مگر ان کی تسلی نہیں ہوئی اب خود بات کر لی ہے تو مطمئن ہو گئے ہیں۔" ثمین ہنسی تھی۔ "سارہ! تم خوش قسمت ہو یار! بہت کم لوگ ہوتے ہیں جن پر قسمت مہربان ہوتی ہے۔" ثمین نے کہا تھا اور وہ تفاخر سے مسکرا دی تھی۔

یہ جملہ اس کے لیے نیا نہیں تھا، وہ اکثر مختلف لوگوں سے یہ جملہ سنتی تھی اور اپنا اعزاز اور حق سمجھ کر وصول کرتی تھی۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں قدرت عطا کرنے میں انتہائی فراخ دلی کا ثبوت دیتی ہے۔ عزت، دولت، شہرت اور محبت، ہر چیز انہیں بے حساب ملتی ہے لیکن خود یہ دوسروں کو کچھ بھی دینے میں انتہائی تنگ دل ہوتے ہیں۔ فخر وغرور کو یہ اپنا حق سمجھتے ہیں اور احسان مندی۔۔۔۔۔! اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"چلو ثمین! سارہ کا پروگرام نہیں ہے، ہم کیوں لیٹ ہو رہے ہیں؟" سارہ شاہ کو پرسکون ہو کر بیٹھے دیکھ کر بہروز ہاشمی نے کہا اور پھر دونوں اسے خدا حافظ کہتے کمرے سے نکل گئے اور ان کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر مراد شاہ کا نمبر ڈائل کیا مگر نمبر ہنوز بند تھا۔ اس نے سیل بیڈ پر پھینک دیا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔۔۔

ایک وہ دن تھا جب وہ امریکا آتی تھی تو مراد شاہ دن میں بیسیوں فون کیا کرتے تھے اور اس کی بھابیاں ان کی دیوانگی پر ہنسا کرتی تھیں۔ لیکن یہ بات تو اب پرانی ہوگئی تھی۔۔۔۔۔ ہر روز ایک بار تو وہ اب بھی فون کیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ مگر نہ انہوں نے کل فون کیا تھا نہ آج۔۔۔۔۔ سارا دن انتظار کرنے کے بعد شام کو اس نے خود فون کیا تھا۔ جب جلدی

جلدی ایک آدھ بات کرنے کے بعد انہوں نے یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا کہ ابھی کچھ دیر میں کال بیک کرتے ہیں اور پھر شام سے رات ہو گئی تھی ان کا فون نہیں آیا تھا۔ آخر اس نے خود فون کیا مگر مراد شاہ کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ اور تب سے اب تک وہ کتنی بار کوشش کر چکی تھی۔ آخر وہ کہاں ہیں؟..... کیسے ہیں؟..... کیا کر رہے ہیں؟..... اور سیل کیوں بند کر رکھا ہے جبکہ وہ جانتی تھی کہ وہ فون بند نہیں کرتے۔ ہاں شادی کے اوّلین دنوں میں چند روز کیا تھا جب وہ سارہ کے ساتھ ہوتے تھے۔ تو اب.....؟ یک دم اسے پرانی بات یاد آئی تو دل میں ایک تلاطم پیدا ہو گیا۔ پھر اس نے بہت کوشش کی تھی اور اپنا دھیان اس بات کی طرف سے ہٹانا چاہا تھا مگر کامیاب نہ ہو پائی تھی۔ کمرے میں تیز تیز اِدھر سے اُدھر چکر لگاتے ہوئے اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی اور پھر سیل اٹھاتے ہوئی ری ڈائل کا بٹن پش کیا تھا اور آپریٹر کے ایک مرتبہ پھر نمبر بند ہونے کی اطلاع پر سارہ شاہ کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ موبائل اس نے دیوار پر دے مارا اور پھر باقی چیزوں کی شامت آ گئی تھی۔ ڈیکوریشن پیسز، ڈریسنگ ٹیبل سے کاسمیٹکس کی چیزیں۔ جو ہاتھ میں آ رہا تھا وہ اٹھا اٹھا کر پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر پھینک رہی تھی۔

''مم..... مما.....!'' حیران و پریشان سا امان دروازے میں کھڑا خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ جو اس وقت قطعاً یہ بھول چکی تھی کہ وہ اپنے گھر میں نہیں تھی جہاں آیا اسے اس موڈ میں دیکھ کر امان کو اِدھر اُدھر لے جایا کرتی تھی۔ امان کے ڈرے ڈرے چہرے کو دیکھتے ہی اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی اور لبوں پر زبردستی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے اس کی جانب بڑھی تھی۔

''مما کی جان.....!'' پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ بے چین دل کو جیسے چین آ گیا تھا۔ اس کے ریشمی بالوں والے سر پر چہرہ ٹکائے وہ جیسے سب کچھ بھول گئی تھی۔

ہاں کچھ ایسی ہی محبت تھی اسے امان سے۔ حالاں کہ امان نے اس کی کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا۔ لیکن اس سے محبت وہ اتنی ہی شدید کرتی تھی جتنی کوئی بھی ماں اپنی اولاد سے کر سکتی تھی۔ وہ سارہ شاہ جو بے حد مغرور تھی۔ بے حد خود پرست تھی۔ جس نے ہر رشتے سے بے حد محبت پائی تھی اور محبت کی کیسے جاتی ہے، وہ اس ہنر سے نا آشنا تھی..... لیکن امان کو پانے سے پہلے تک..... اسے گود میں لینے اور دل میں جگہ دینے سے پہلے تک..... ''تم نے کھانا کھا لیا مائی سن!'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''مگر کیوں.....؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا تھا کیوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ ملازمہ کو کہہ کر آئی تھی کہ وہ اسے کھانا کھلا دے۔

''میں نے سوچا ہم اکٹھے کھائیں گے۔'' امان نے اس کے گلے میں بازو حائل کرتے ہوئے کچھ ایسی معصومیت سے کہا کہ سارہ شاہ کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس نے بے اختیار اسے ساتھ بھینچتے ہوئے اس کے ماتھے کو چوما پھر اس کی بھوک کے خیال سے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں چینج کر لوں پھر کھانا کھاتے ہیں۔''

''میں کھانا لگواؤں مما؟'' وہ مستعدی سے اٹھتے ہوئے بولا تو نثار ہوتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سارہ شاہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ پھر دونوں نے مل کر کھانا کھایا تھا اور امان کی پیاری پیاری باتوں میں وہ اپنی ساری پریشانی تقریباً بھول سی گئی تھی لیکن جب امان سو گیا اور کمرے میں بالکل خاموشی چھا گئی تو اس کی سوچ کی پرواز پھر مراد شاہ تک جا پہنچی۔ کسی انہونی کا احساس تھا یا کیا..... دل عجیب سی بے کلی کا شکار تھا اور اپنی یہ کیفیت اسے خود بھی حیران و پریشان کر رہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا تھا کہ چوکی دار کے پاس بھی تو فون ہے پھر وہ اسے کیوں فون نہیں کر رہی۔

''آخر یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔ کل سے خوامخواہ اپنا خون جلا رہی ہوں؟'' اس نے تیزی سے چوکی دار کا نمبر ملاتے ہوئے اپنی عقل کو کوسا تھا۔

پہلی بیل پر ہی فون ریسیو کر لیا گیا تھا اور اس کی آواز سنتے ہی بشیر فوراً مستعد ہو گیا تھا۔

''السلام علیکم بیگم صاب جی!''

''وعلیکم السلام۔ یہ کل سے تمہارے صاحب کہاں غائب ہیں؟'' سلام کا جواب دیتے ہی اس نے فوراً مراد شاہ کے بارے میں پوچھا۔

"کل سے.....!" بشیر نے زیرلب دہرایا اور پھر فوراً ہی اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے بے حد رازداری سے کل کی پوری روداد سنانا شروع کر دی تھی اور سارہ شاہ کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

"روز بروز بگڑتے ہوئے ملک کے حالات، وفاقی حکومت کے خلاف صوبائی حکومتوں کی بڑھتی ہوئی شکایات، ہر روز بڑھتی ہوئی مہنگائی کے خلاف عوام کا احتجاج، بجلی اور گیس کی قیمتوں میں اضافے، لوڈ شیڈنگ کے خلاف ہڑتالیں، سیکیورٹی فورسز کی کارروائیاں اور اپنے گھر بار چھوڑ کر بے سروسامان روتے بلکتے لوگوں کی دُہائیاں....." بوجھل ہوتے دل کے ساتھ مراد شاہ نے اخبار میز پر رکھ دیا تھا۔ چند لمحے کسلمندی سے بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئے۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے بعد صبح سے طبیعت پر چھائی پژمردگی خاصی حد تک کم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ حسبِ معمول تیار ہونے سے قبل ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا اور پھر واپس پلٹتے پلٹتے یک دم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

سنو جاناں
جولائی آ گیا ہے

"جولائی.....!" انہوں نے زیرلب دہرایا تھا۔ دل کے ٹھہرے ہوئے سمندر میں کسی یاد نے یوں کنکر پھینکا تھا کہ ہر سو اک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ یہی مہینہ تو تھا جب وہ بے حد عام سی، گمنام سی لڑکی ان کی زندگی میں آئی تھی اور زندگی کا عنوان بدل کر چلی گئی تھی۔ انہوں نے خالی خالی نگاہوں سے ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا تھا کوئی شاعر اپنا کلام سنا رہا تھا۔

گھٹن اوڑھے ہوئے دن ہیں
ہوا کے لمس سے نا آشنا شامیں!
ستاروں سے بھری راتیں
کہ جن میں نیند کی دیوی بھی اکتائی سی لگتی ہے
اسی بے کیف منظر میں
اچانک آسمان بادل کی چادر اوڑھ لیتا ہے
وہ چھاجوں مینہہ برستا ہے
کہ منظر جھوم اٹھتا ہے
سنو جاناں.....!
وہی موسم، وہی رُت ہے
کہ جب ایسے گھٹن اوڑھے دن کی
برستی شام میں ہم تم
فضا کی گنگناہٹ روح میں محسوس کرتے تھے
کبھی بوندیں پکڑتے تھے

کبھی یوں مسکراتے تھے
کہ جیسے کان میں بارش نے کوئی بات کہہ دی
ہو سنو جاناں
وہی موسم، وہی رُت ہے
گھٹن اوڑھے ہوئے دن ہیں
فضا بھی گنگناتی ہے
نہ جانے تم کہاں پر ہو
چلے بھی آؤ کہ اب جاناں!
تمہیں بارش بلاتی ہے

''تمہیں بارش بلاتی ہے!'' بے حد دھیمے کھوئے سے لہجے میں انہوں نے دہرایا اور تبھی لائٹ چلی گئی تھی، باہر سے آتی تیز آوازوں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ ''یہ آوازیں کیسی آرہی ہیں؟'' تیز تیز قدموں سے مرادشاہ بیڈروم سے نکلے اور بھاگنے کے سے انداز میں اندر آتے خانساماں سے پوچھا تھا۔

''صاحب جی! بشیر نے ایک عورت کو پکڑ رکھا ہے جو کل سے کوٹھی کے اردگرد منڈلا رہی تھی اور آج..... ارے، ہائے!..... میرا گوشت.....'' ایک دم وہ بات ادھوری چھوڑ کر دہائی دیتا کچن کی طرف بھاگا تھا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر کی جانب بڑھے۔

بشیر کسی عورت کو تقریباً کھینچتے ہوئے اندر لا رہا تھا۔ ''کیا بات ہے بشیر؟ کون ہے یہ؟''

''صاحب جی! کل یہ عورت پتا پوچھنے کے بہانے اندر گھسی آرہی تھی۔ بعد میں دو تین بار اِدھر چکر لگاتی نظر آئی..... میں چونکا تو سہی مگر پھر اپنا وہم سمجھ کر بیٹھا رہا۔ پر آج کیا ہوا صاحب جی! میں اندر تھا، باہر آیا تو یہ اچک اچک کر گیٹ سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی..... مجھے دیکھتے ہی رفو چکر ہونے لگی۔ خیر میں بھی پوری طرح چوکنا تھا.....''

''مختصراً بتاؤ بشیر.....!'' اس کے مزے لے لے کر بتانے پر انہوں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''صاحب جی! ابھی یہ ارحم صاحب کے بیٹے سے امان بابا کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ اب باقی اس سے آپ ہی اگلوائیں۔'' اس نے جھٹکے سے عورت کو چھوڑا تھا، وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکی تھی اور ان کے قدموں میں آگری تو ان کے پاؤں کو یک دم جیسے گرم انگاروں نے چھو لیا تھا۔

''اف..... اس قدر تیز بخار.....'' ان کا نرم اور ہمدرد دل پل میں گداز ہو گیا تھا۔ ''ماسی! اٹھاؤ اس کو۔ یہ تو تیز بخار میں پُھنک رہی ہے..... اٹھنے تک کی تو سکت نہیں اس میں..... کچھ مدد کے لیے آئی ہوگی بے چاری اور یہ بشیر، اس کا تو دماغ خراب ہے۔ ہر بات کو اپنی مرضی کے معنی پہنا کر کہانی بنانے میں ماہر ہے یہ.....'' وہ بشیر کو گھورتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''اور ہاں..... اس کو کچھ کھانے کے لیے بھی لا کر دو۔'' کہتے ہوئے انہوں نے جیب سے والٹ نکالا تھا اور پانچ پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے تھے۔ ماسی کے سہارے کھڑی اس عورت نے جس کا پورا چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا، نگاہیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا بخار کی حدّت سے جلتی آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی آنکھیں..... مرادشاہ کے دل میں ایک شدید تلاطم برپا کر گیا۔

یہ آنکھیں.....! یہ آنکھیں تو وہ صدیوں اور قرنوں کے بعد بھی پہچان سکتے تھے..... کہاں کہاں نہیں کھوجا تھا انہوں نے ان آنکھوں کو۔ کیسے مارے مارے نہیں پھرے تھے۔ ہر چادر میں چھپے چہرے کو یا ہر برقع میں لپٹے وجود کو پاگلوں کی مانند سامنے سے جا کر دیکھا کرتے تھے اور ہر بار ناکامی پر بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود سے سوال کرتے تھے کہ آخر وہ کیوں اسے کھوج رہے تھے۔ کیوں اس کی جستجو میں ہلکان اور پریشان تھے کیا وہ اس عام سی، گمنام سی لڑکی کو سارہ شاہ کے

مقابل لاکھڑا کرنے کی ہمت اور حوصلہ رکھتے تھے.....؟'' سارہ شاہ.....! جو اُن کی من چاہی بیوی تھی۔ ایک صنعت کار کی بے حد لاڈلی بیٹی اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ مغرور، خودسر اور خود پرست سارہ شاہ ایک دوسری عورت کو جو مرتبے میں، شکل وصورت میں، تعلیم میں اس کے سامنے کچھ بھی نہ تھی، اپنے برابر برداشت کرسکتی تھی؟ نہیں..... کبھی نہیں.....! ہمیشہ ایک ہی جواب ملتا تھا لیکن پھر بھی ان کی تلاش ختم نہیں ہوئی تھی۔ اور اب بالکل غیر متوقع طور پر وہ ان کے رُوبرو تھی۔

''فضا! فضا..... کہاں چلی گئی تھیں تم.....؟ کہاں جا چھپی تھیں؟'' انہوں نے بے حد بے تابی سے اس کے چہرے کو تھاما تھا۔ ان گھور سیاہ آنکھوں میں حیرانی ہی حیرانی تھی۔ بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ پھر وہ آنکھیں بند ہونے لگی تھیں اور اگلے ہی لمحے وہ لہراتی ہوئی ان کے بازوؤں میں آرہی تھی اور انہوں نے بے حد احتیاط اور محبت کے ساتھ اسے بازوؤں میں اٹھالیا تھا۔

''بشیر! ڈاکٹر حامد کو فون کرو کہ ایمرجنسی ہے۔ جلدی آئیں۔'' اندر کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے منہ کھولے کھڑے بشیر سے کہا تھا اور سب نوکروں کو حیران کھڑا چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئے تھے۔

''یہ آنکھیں جتنی خوب صورت ہیں چہرہ اسی قدر بدصورت ہے شاہ جی.....! آپ وعدہ کریں کہ کبھی بھی اس بدصورت چہرے کو دیکھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔''

وہ چند لمحے اس کی بند آنکھوں کو دیکھتے رہے تھے پھر یہ خیال آتے ہی کہ ابھی ڈاکٹر حامد پہنچنے والے ہیں اور ان کے آنے سے پہلے وہ اس کی خستہ حال چادر بدل دینا چاہتے تھے۔

الماری سے سارہ کا دوپٹہ نکال کر وہ اس کی جانب آئے اور چادر کے ایک جانب کی گرہ کھولتے ہوئے چادر اتار دی تھی اور پھر جیسے ششدر سے رہ گئے تھے۔ گندم کی بالیوں کی مانند چمکتی سنہری رنگت، خوب صورت کھڑی ناک اور چھوٹا سا دہانہ۔ وہ تو کوئی بے حد بدصورت چہرہ دیکھنے کو تیار تھے جبکہ یہ تو..... ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ کیا معمہ تھا۔ کیسا اَسرار تھا..... وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ وہ کیوں جھوٹ بولتی رہی تھی۔ ہر وقت چہرے کو ڈھانپے رکھنا کتنا مشکل تھا اور یہ مشکل ایسی صورت میں اٹھانا تو مجبوری تھی کہ وہ واقعی اتنا بدصورت ہوتا کہ کسی کے دیکھنے کے قابل ہی نہ ہوتا اور وہ تو یہی سمجھتے تھے بلکہ سمجھتے کیا تھے خود اسی نے کئی بار انہیں یہ باور کروایا تھا۔ مگر کیوں..... کس لیے.....؟ بے حد الجھے الجھے سے یک ٹک اسے دیکھتے وہ سوچ رہے تھے۔

''اچھا سنو.....'' انہوں نے دروازہ کھولتے ہوئے بشیر کو پکارا تھا۔ ''ماسی سے کہو کسی برتن میں ٹھنڈا پانی ڈال کر لے آئے۔''

''بہت بہتر جی.....!'' چور نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے کہا اور واپس پلٹ گیا تھا۔

انہوں نے آہستگی کے ساتھ بے حد نرمی سے اس کی بند پلکوں کو چُھوا تھا۔ کس قدر عجیب اور انوکھی لڑکی تھی وہ.....! قدم قدم پر انہیں اچنبھے میں ڈالتی رہی تھی۔ ایک ایسی بجھارت جسے جتنا بوجھنے کی سعی کرتے تھے اتنا ہی الجھتے جاتے تھے۔ اس کے آگ کی طرح تپتے چہرے پر اک عجیب سی طمانیت پھیلی ہوئی تھی یوں جیسے بے ہوشی میں بھی ان کی توجہ اور محبت کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے ہوئے وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ڈاکٹر حامد نے اسے نیند کا انجکشن لگاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ آرام کی تاکید کی تھی اور ان کا دل چاہتا تھا کہ گھڑی کے چوتھائی پل میں وہ اٹھ جائے، شدید بے چینی سے وہ اس کے اٹھنے کے منتظر تھے اور وہ تھی کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ پھر اس کے صبیح چہرے پر نگاہ جمائے جمائے جانے کس وقت وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں جا نکلے تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ جون کا ایک بے حد گرم دن تھا جب ان کو اماں بی کی شدید علالت کی خبر ملی تھی اور وہ بے چین ہو اٹھے تھے۔ کئی دن سے انہوں نے انہیں فون تک نہیں کیا تھا حالاں کہ جانتے تھے کہ پچھلے کئی ماہ سے وہ مسلسل علیل تھیں۔ پہلے کچھ دن وہ سارہ کے بھائی کی شادی میں مصروف رہے تھے۔ اس کے بعد کام کام اور صرف کام اور کسی چیز کا جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔ مصروف تو وہ پہلے بھی بے حد رہتے تھے لیکن اب اسلام آباد میں کمپنی کی نئی برانچ قائم کرنے سے جو تھوڑی بہت فراغت میسر آتی تھی وہ بھی جاتی رہی تھی۔

''آخر کیا فائدہ ہے اس سب کا..... کیوں یہ سب بکھیڑے بڑھائے چلا جاتا ہوں میں.....؟'' گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا اور دل میں ہر سو اداسی ہی اداسی پھیل گئی تھی۔ دنیا کی کون سی نعمت تھی جو ان کے پاس نہیں تھی..... ہاں ایک اولاد کی نعمت..... جس کے نہ ہونے سے جیسے کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ تہی دامن تھے۔ ایک اس کمی نے جیسے ہر چیز کو ادھورا کر دیا تھا۔ تمام خوب صورتی ماند تھی۔ سب رنگ پھیکے تھے۔ گو انہوں نے سارہ سے کبھی اس کمی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کبھی اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ زندگی میں کیسا خلا محسوس کرتے ہیں اور وہ ایک خواہش کیسے کیسے ان کے اندر اودھم مچاتی ہے۔ لیکن وہ لاکھ اس سے انکار کرتے مگر جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا تھا۔ ان کی یہ خواہش شدت اختیار کرتی جا رہی تھی ہمیشہ وہ سارہ کی خاطر اسے تھپک تھپک کر سلاتے رہتے تھے۔ اس سے نگاہ چرائے اسے جھٹلاتے رہتے تھے..... کبھی وہ سوچتے یہ کمی اگر ان میں ہوتی تو کیا سارہ ان کی خاطر ان کی ذات کے لیے اپنی خواہش سے دست بردار ہو جاتی.....؟ نہیں کبھی نہیں.....! جواب اتنا واضح اور فوری تھا کہ انہیں اپنے دل کی رگیں ٹوٹتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ پھر اسی ذہنی اضطراب اور خلفشار میں انہیں پتا بھی نہیں چلا تھا اور رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی تھی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔ ان کا ذہن گہری تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

اب پتا نہیں خدا کو ان کے انتظار میں بچھی ماں کی آنکھوں پر رحم آ گیا تھا یا کسی کی دعائیں ایسا مضبوط حصار باندھے تھیں کہ معجزانہ طور پر گاڑی کا دروازہ کھلا اور وہ سڑک پر جا پڑے تھے۔ گاڑی قلابازیاں کھاتی ہوئی گہری کھائیوں میں جا گری تھی اور آگ لگنے کی وجہ سے راکھ کا ڈھیر بن گئی تھی۔ سڑک کے کنارے پڑے نوکیلے پتھر لگنے کی وجہ سے ان کا خون بے حد ضائع ہو گیا تھا اور ان کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی لیکن یہاں بھی جیسے غیبی مدد آئی تھی اور انہیں معجزانہ طور پر بروقت خون مل گیا تھا۔

''پتا نہیں کون تھی وہ جو اُن کی زندگی کی خاطر اپنی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ دینا چاہتی تھی؟'' انہوں نے ہوش میں آنے کے بعد کئی بار بے حد اچنبھے سے سوچا تھا۔

''مراد صاحب! اپنے گھر والوں کو مطلع نہیں کیا آپ نے.....؟'' سسٹر ماریہ کی بات نے ان کی سوچوں کا رخ موڑ دیا تھا۔

''کیسی عورت تھی یہ سارہ شاہ بھی..... کس قدر چاہا تھا انہوں نے اسے..... والہانہ محبت کی تھی۔ اپنے سچے اور کھرے جذبوں کو دیوانہ وار اس پر نچھاور کر دیا تھا۔ اور وہ اک مغرورانہ اور تفاخرانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ یہ سب کچھ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی رہی تھی۔ ٹھیک ہے وہ ان کی بیوی تھی، ان کی محبتوں اور چاہتوں پر اس کا حق تھا، لیکن کیا وہ خود ان سب چیزوں کے حق دار نہیں تھے.....؟ رفاقت کے طویل دس سالوں میں محبتوں سے بھرپور اک نگاہ بھی تو ان کا مقدر نہیں بنی تھی۔ چاہتوں سے لبریز کوئی ایک والہانہ و بیتابانہ جملہ زادِ راہ کے طور پر ان کے پاس نہیں تھا۔

''کیا بات ہے سر! کوئی پریشانی؟'' سسٹر ماریہ اپنی پیشہ وارانہ مستعدی کے ساتھ ان کے قریب آتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''سر میں کچھ درد سا محسوس ہو رہا تھا۔ کیا آپ بتا سکیں گی کہ میری آنکھوں کی یہ پٹی کب کھلے گی؟''

''بہت جلد سر! آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔ سر پر چوٹ اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے روشنی آپ کی آنکھوں کے لیے ٹھیک نہیں تھی اس وجہ سے چند دنوں کے لیے آپ کی آنکھوں کو ڈھانپ دیا گیا ہے۔''

''سسٹر ماریہ! کیا کسی طرح اس لڑکی کا پتا معلوم کیا جا سکتا ہے؟'' کچھ دیر خالی الذہنی کی کیفیت میں لیٹے رہنے کے بعد انہوں نے کھوئے کھوئے سے انداز میں پوچھا۔

''کس لڑکی کا سر.....! اچھا.....! جس نے آپ کو خون دیا تھا.....؟ بہت مشکل ہے۔ گو یہ چھوٹا سا قصبہ ہے سر! لیکن بغیر کسی نام اور پتے کے کسی کو کیسے ڈھونڈا جا سکتا ہے؟ ویسے سر عجیب سر پھری سی لڑکی تھی وہ، ڈاکٹر داؤد ایک بوتل کے بعد کسی طرح بھی اور خون لینے کے لیے تیار نہیں تھے کیوں کہ وہ خود بہت کمزور سی تھی لیکن اس نے دھمکی دی کہ اگر خون نہ لیا تو وہ اپنی کلائی کی رگ کاٹ لے گی۔ اگر یہ خون آپ کی زندگی بچانے کے کام نہیں آ سکتا تو پھر اس کے جسم میں بھی نہیں رہے گا۔ وہ ایسی دیوانگی میں کہہ رہی تھی کہ اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کر گزرتی۔ پھر آپ کو بھی خون کی اشد ضرورت تھی اس لیے ڈاکٹر داؤد نے مجبوراً خون کی دوسری بوتل بھی لے لی، لیکن پھر وہی ہوا جس کا ڈر

تھا۔اس کی اپنی حالت اچھی خاصی بگڑ گئی تھی...... ''مسٹر ماریہ بتا رہی تھی اور ان کی عجیب سی کیفیت تھی۔
''آپ کے لیے تو وہ لڑکی فرشتۂ رحمت ثابت ہوئی سر! ورنہ اس وقت تو آپ کا گروپ دستیاب نہیں تھا۔اس لیے ہم تو آپ کی زندگی سے تقریباً مایوس ہی ہو چلے تھے لیکن سچ ہے جسے اللہ رکھے......''انہیں سننے کے موڈ میں دیکھ کر وہ پھر سے شروع ہو چکی تھی۔
اور مراد شاہ پل کے ہزارویں حصے میں اپنی اس محسنہ کے بارے میں جان لینا چاہتے تھے جس کی بدولت انہیں یہ نیا جیون ملا تھا۔جس کی عنایت کی مرہونِ منت ان کی یہ چلتی سانسیں تھیں
''لیکن...... آخر وہ تھی کون...... کیوں کیا تھا اس نے یہ سب کچھ بغیر کسی جان پہچان کے...... بغیر کسی تعلق اور واسطے کے کوئی کیسے اس حد تک جا سکتا ہے...... ممکن ہے اسے ان میں کسی اپنے کا عکس نظر آتا ہو۔کسی چاہنے والے کی شبیہ، جو دنیا کے میلے میں کہیں کھو گیا ہو یا شاید راہی عدم ہو گیا ہو...... خود ہی مختلف اندازے لگاتے لگاتے وہ عجیب سے احساسات میں گھر گئے تھے۔دل میں اس سے ملنے کی شدید تمنا ابھری تھی۔اور ان کی طلب ہی اس قدر شدید تھی یا وہ لمحہ ہی قبولیت کا تھا کہ اسی شام مسٹر ماریہ کے ساتھ وہ ان کے کمرے میں موجود تھی۔مسٹر ماریہ نے اس کا مختصر سا تعارف کروایا تھا اور ان سے پوچھ کر باہر چلی گئی تھی۔
''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی......؟''پھولوں پر جیسے شبنم گری تھی اور فضا میں کیٹس کے نغموں کی سی گنگناہٹ پھیل گئی تھی۔
ان کا شدت سے دل چاہا تھا کہ آنکھوں پر سے پٹی اتار دیں اور اس کو دیکھیں۔وہ کون تھی...... کیسی تھی...... لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔بے چینی سے آواز کی سمت دیکھتے ہوئے انہوں نے آواز سے ہی اس کی شخصیت کا خاکہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن پھر فوراً ہی اپنی خاموشی پر عجیب سا محسوس کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔
''آپ کی بے پایاں اور بروقت مدد کی بدولت بالکل ٹھیک ہوں۔''
میں تو کسی قابل نہیں...... یہ کہیے کہ اللہ کا احسان ہے۔''
''بے شک...... لیکن اللہ اپنے بندوں کی امداد کے وسیلے بناتا ہے۔آپ کی اتنی بڑی نیکی نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے اس احسان کا بدلہ اتار سکوں گا؟''
''بدلہ تو خیر آپ اتار سکتے ہیں......''قدرے توقف کے بعد اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اطمینان سے کہا تھا اور ایک گہری سانس لینے کے بعد جیسے وہ کسی نتیجے پر جا پہنچے۔
تو وہ کوئی ضرورت مند تھی۔شاید بہت مجبور...... اس حد تک کہ اپنا خون بیچنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔مگر اسے کیسے پتا تھا کہ وہ اس خون کی ٹھیک ٹھاک قیمت دے سکتے تھے جبکہ یہاں تو انہیں کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔اور پہچانتا بھی کیسے؟...... وہ کوئی ایسی مشہور و معروف شخصیت تو تھے نہیں اور باقی ان کی شناخت کا سارا سامان تو گاڑی میں ہی جل کر راکھ ہو گیا تھا۔پھر یہ لڑکی......! مگر ضروری تو نہیں کہ ایسی کوئی بات ہو...... آخر اس نے ایسا کہا ہی کیا تھا جو وہ پل میں فیصلہ کر بیٹھے ہیں۔خود کو ڈپٹتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔
''میں ایسا نہیں سمجھتا۔آپ نے میری زندگی بچائی اس احسان کا کوئی بدلہ ہو ہی نہیں سکتا۔لیکن اگر کسی بھی طرح میں آپ کے کسی بھی کام آسکوں...... آپ کے لیے کچھ کر سکوں تو مجھے بے حد مسرت ہو گی۔''ان کا خیال تھا زیادہ سے زیادہ وہ کیا مانگے گی۔ایک آدھ لاکھ یا دو چار لاکھ...... غریب بہت لمبی چھلانگ بھی لگائے تو آخر کتنی لگائے گا......؟''پلیز......! میں منتظر ہوں۔''
''آپ سوچ لیجیے۔شاید جو میں مانگوں، آپ نہ دے سکیں۔''
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔آپ حکم کریں۔''

''اچھی طرح سوچ لیجیے۔یہ آپ کے لیے اتنا آسان نہیں ہوگا.....'' وہ جیسے مکمل یقین دہانی چاہتی تھی۔

''آپ میری محسنہ ہیں۔میری یہ زندگی آپ کے خون کے مرہون منت ہے۔آپ کی اس نیکی کی میں تہہ دل سے قدر کرتا ہوں اور یقین جانیے، میں احسان فراموش کہلانے پر مرجانے کو ترجیح دینے والا بندہ ہوں۔آپ کہیے۔جو آپ مانگیں گی، آپ کو ضرور ملے گا۔

''وعدہ.....؟''

''جی فرمایئے!'' وہ جیسے ہمہ تن گوش تھے۔

''آپ مجھ سے شادی کر لیجیے۔'' بڑے آرام سے کہا گیا تھا۔

''کیا!'' ان کے منہ سے نکلا تھا اور وہ کراہ کر رہ گئے تھے۔وہ لپک کر ان کے قریب آئی تھی اور انہیں پرسکون ہونے کی تلقین کرنے لگی تھی۔اور وہ اس کی اتنی بڑی جسارت، اس قدر جرأت پر ششدر تھے۔وہ تو یوں اس سے شادی کی فرمائش کر رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو آپ مجھے بس سو روپے دے دیجیے۔

''مراد صاحب! میں ایک بے حد بے مایہ اور حقیر سی لڑکی ہوں۔غربت کے ساتھ ساتھ بدصورتی مجھے ورثے میں ملی ہے مگر گوشت پوست کا یہ لوتھڑا جسے دل کہتے ہیں یہ تو امیر اور غریب، خوب صورت اور بدصورت لوگوں میں ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ویسے ہی آرزو بھی کرتا ہے۔تڑپتا بھی ہے۔مچلتا بھی ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھی اور وہ گنگ سے اسے سن رہے تھے۔

''میری یہ خواہش آپ کو یقیناً میری اوقات اور بساط سے بڑھ کر لگ رہی ہوگی مگر میرے خیال میں یہ ایسی بھی بڑی نہیں کیوں کہ میں تاعمر تو آپ کا ساتھ نہیں چاہتی۔چاہ بھی نہیں سکتی، میں تو صرف چند دن ہی آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔جب تک آپ ٹھیک نہیں ہو جاتے۔آپ کی آنکھوں کی پٹی نہیں کھل جاتی۔سنا ہے ایک خوب صورت مرد کی الفت اور قربت سے بڑھ کر خوب صورت کوئی احساس نہیں۔میں جانتی ہوں الفت میرا مقدر نہیں بن سکتی۔ہاں قربت کے یہ چند روز جو معجزانہ طور پر مجھے حاصل کرنے کا موقع ملا ہے انہیں میں کھونا نہیں چاہتی۔نکاح کے بندھن کے ساتھ یہ چند دن۔اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔آپ کی آنکھوں کی پٹی کھلتے ہی میں آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔اسی خاموشی کے ساتھ جیسے داخل ہوں گی۔'' اس نے بے حد رواں اور پرسکون لہجے میں اپنی بات ختم کی اور خاموش ہو گئی تھی۔وہ کافی دیر تک اس کے مزید بولنے کے منتظر رہے مگر جب یہ خاموشی زیادہ طویل ہونے لگی تھی تو انہوں نے کھنکھارتے ہوئے گلا صاف کیا تھا اور کچھ کہنا چاہا تھا لیکن کیا! وہ اس سے کیا کہیں.....اس کی باتوں کے جواب میں اس سے کچھ بھی کہنا، اتنا آسان کہاں تھا۔عجیب صورت حال تھی۔پتا نہیں وہ لڑکی پاگل تھی یا ضرورت سے زیادہ ہوشیار، وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔اس کی باتوں نے انہیں شش و پنج میں ہی نہیں بلکہ شدید اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔آواز سے تو وہ قطعاً کوئی تیز طرار لڑکی نہیں محسوس ہو رہی تھی لیکن آواز سے کیا پتا چلتا ہے۔وہ اسے دیکھ سکتے تو شاید کچھ اندازہ ہوتا اور اس سوچ کے ساتھ ہی انہیں ایک بار پھر شدید بے چینی نے آگھیرا تھا کہ آخر وہ کب دیکھ سکیں گے۔

''آپ تو بڑی گہری سوچ میں پڑ گئے مراد صاحب!'' اس کی دھیمی سی آواز نے گہری خاموشی میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا اور چند لمحے تو خاموش رہے تھے پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے مخاطب کیا تھا۔

''دیکھیں محترمہ! شادی بیاہ کھیل نہیں ہوتا کہ ایک بازی لگائی اور ختم کر دیا۔مجھے نہیں علم کہ آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں۔اس کے پیچھے آپ کا کیا مقصد ہے لیکن اگر واقعی یہ صرف آپ کی بے ضرر سی خواہش بھی ہو تو کیا آپ نے سوچا ہے کہ چند دن کی اس نام نہاد قسم کی شادی کے بعد آپ کا مستقبل کیا ہوگا اور ایک ایسا شخص جو خود پٹیوں میں جکڑا ہوا ہے، اس سے یہ چند روزہ تعلق جوڑ کر آپ کو کیا حاصل ہوگا؟''

''بہت.....بہت کچھ.....'' بہت دھیمی سی سرگوشی نما آواز تھی یوں جیسے کوئی خواب میں بول رہا ہو۔

مراد شاہ بری طرح چونکے تھے اور وہ جیسے یک دم سنبھلی تھی۔

"میں آپ سے کچھ چاہ ہی کب رہی ہوں سوائے اس بندھن کے؟ جسے آپ جب توڑنا چاہیں آپ کے اختیار میں ہوگا اور میں یہ باقاعدہ آپ کو لکھ کر دوں گی۔" یہ لہجہ..... یہ انداز..... انہوں نے خود کو شدید بے چینی میں گھرتے محسوس کیا تھا۔ آخر وہ کون تھی، انہیں پورا یقین ہو چکا تھا کہ وہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھی بلکہ نہیں وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ اس کے لہجے میں اپنائیت ہی نہیں، محبت بھی تھی، کچھ پا لینے کی طلب سے زیادہ سب کچھ نثار کر دینے کی خواہش تھی یوں جیسے ان سے تعلق جوڑنا اس کی کسی شدید ترین خواہش کی تکمیل ہو، کسی بہت دیرینہ خواب کی تعبیر! مگر سوال پھر وہی ذہن میں ابھرتا تھا کہ آخر وہ کون تھی۔ اور یوں ایکا ایکی کہاں سے آ گئی تھی۔ انہوں نے اب بے چینی کے ساتھ ساتھ خود کو بے بسی میں گھرتے محسوس کیا تھا۔ وہ اسے دیکھنا چاہتے تھے مگر نہیں دیکھ سکتے تھے، پھر اسی مخصوص سی بے کلی نے انہیں آ گھیرا تھا کہ آخر وہ کب دیکھ سکیں گے۔ انشاء اللہ جلد ہی! انہوں نے خود کو جیسے یقین دلایا تھا اور پھر یہ یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ کیا یہ آواز پہلے انہوں نے سنی تھی؟ نہیں..... کبھی نہیں! ذہن نے جیسے فوراً نفی کی تھی۔

"مراد صاحب! کیا سوچنے لگے آپ..... یاد ہے آپ مجھ سے وعدہ کر چکے ہیں کہ جو میں مانگوں گی آپ دیں گے؟" بڑے جتاتے ہوئے انداز میں کہا گیا تھا اور ان کے لیے مزید کچھ کہنے یا سننے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

پھر اسی شب کو وہ صرف شرعی حق مہر کے عوض ان کے ساتھ نکاح کے بندھن میں بندھ گئی تھی۔ اس دور میں یہ حق مہر.....! یا تو وہ کوئی پاگل تھی یا پھر اس کا کوئی اور مقصد تھا..... مگر کیا؟ وہ الجھے الجھے سے سوچ رہے تھے۔ دو خواتین اور ایک آدمی جن کو اس نے اپنا دور پرے کا عزیز بتایا تھا نکاح کے بعد دعائیں دیتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تھے۔ تو وہ ان کے قریب آ بیٹھی تھی اور ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ پھر کئی لمحے دبے پاؤں گزر گئے تھے۔ اس کے ہاتھ کے نیچے ان کا ہاتھ جیسے پگھلنے لگا تھا۔ عجیب سا گداز تھا جو اس کے ہاتھ سے ہوتا ان کے پورے جسم میں پھیلتا جا رہا تھا۔ اس کی خاموشی انہیں کھلنے لگی تھی۔ وہ کچھ کہہ کیوں نہیں رہی تھی..... ان کا دل چاہ رہا تھا وہ کچھ بولے، کچھ کہے، مگر کیا.....! وہ اس سے کیا سننا چاہتے تھے؟ انہوں نے کچھ حیرانی سے سوچا تھا۔ خاصی دیر گزر گئی تھی اور وہ بالکل خاموش تھی۔ کمرے میں سوائے گھڑی کی ٹک ٹک کے اور کوئی آواز نہیں تھی۔ جب یہ خاموشی طویل ہونے لگی تو انہوں نے خود ہی گونگے لمحوں کو زبان دینے کا قصد کیا تھا۔

"تمہاری خواہش کے مطابق میں نے تم سے یہ تعلق استوار کر لیا ہے حالاں کہ یہ میرے لیے آسان نہ تھا۔ میرا گھر ہے، بیوی ہے، نام ہے اور ایک وسیع سوشل سرکل ہے..... لیکن میں نے آج تک کسی کا احسان نہیں لیا۔ کسی کا قرض نہیں رکھا اور کسی سے وعدہ خلافی نہیں کی، تمہاری بات اگر میں نہ مانتا تو مجھے زندگی کے ان تینوں اصولوں سے انحراف کرنا پڑتا۔ اس لیے میں نے ہر طرح کا رسک لیتے ہوئے تمہاری یہ بات مان لی ہے، جو یا تو تمہارا ذہنی خلل ہے یا پھر..... خیر میں تمہارے اس اقدام سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی تم سے معاہدہ کر چکا ہوں۔ ہاں ایک گزارش ہے کہ میرا کوئی ملنے والا، رشتہ دار یا دوست آ جائے جس کا امکان تو کم ہی ہے، تب تم خود کو نرس بتانا۔" اپنی بات کہہ کر وہ خاموش ہو گئے تھے اور منتظر تھے کہ وہ کچھ کہے گی لیکن وہ ہنوز چپ سادھے ہوئے تھی۔ اور حیرانی تو انہیں اپنی کیفیت پر ہو رہی تھی۔ یوں خوامخواہ جھنجلانا ان کی عادت نہیں تھی۔

چند لمحے اس کے کچھ بولنے کا انتظار کرنے کے بعد انہوں نے خود ہی اسے مخاطب کیا تھا۔

"اب تم اس قدر خاموش کیوں ہو۔ کیا پچھتا رہی ہو؟"

"پچھتاتے وہ ہیں جو کام کرنے سے پہلے سوچنے کے عادی نہیں ہوتے اور جو ہر کام سوچ سمجھ کر کرتے ہیں، انہیں کم از کم اپنے عمل پر پچھتاوا نہیں ہوتا۔ خاموش تو میں اس لیے ہوں کہ آپ کی موجودگی محسوس کر رہی ہوں۔"

کتنی نرم و رسیلی سی آواز تھی یوں جیسے رم جھم بارش ہونے لگے۔ انہوں نے بے اختیار گہری سانس لی۔ انہیں اب پتا چلا تھا کہ وہ یہ آواز سننے کے لیے اس قدر بے چین تھے کہ خاموشی انہیں کوفت میں مبتلا کرنے لگی تھی۔

''آپ کے درد تو نہیں ہو رہا؟'' اس نے ان کا وہ ہاتھ جس پر اپنا ہاتھ رکھا ہوا تھا دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں، اب تو نہیں ہو رہا۔'' بے ربط دھڑکنوں کے درمیان وہ جیسے بے اختیار کہہ گئے تھے۔

''آپ کے ہاتھ کتنے صاف و شفاف اور خوب صورت ہیں شاید اس لیے کہ ان ہاتھوں نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔''

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟'' وہ ایک دفعہ پھر بری طرح چونکے۔

''میں جانتی ہوں۔ مجھے یقین ہے۔'' بے اختیار سے انداز میں کہتے کہتے وہ جیسے یک دم سنبھلی تھی اور اگلے ہی لمحے مراد شاہ کے جسم میں برق سی لہرائی تھی اور دھڑکنوں میں تلاطم برپا ہو گیا تھا۔ اس نے ان کا ہاتھ آنکھوں سے لگا لیا تھا۔

''آپ جانتے ہیں، آج میں کتنی خوش ہوں؟ بہت..... بے حد و حساب۔ آج میری وہ خواہش پوری ہوئی ہے جس کے یوں پورا ہونے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں آپ کو دور سے دیکھ کر سوچا کرتی تھی کہ آپ قریب سے کیسے ہوں گے اور آج میں آپ کو چھو کر دیکھ سکتی ہوں۔ آپ کی پیشانی، آپ کی آنکھیں، آپ کی ناک، آپ کے بال، پتا نہیں یہ سب کیسے ممکن ہو گیا؟ وہ بھی اتنی آسانی سے! بالکل معجزانہ طور پر!'' وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں بول رہی تھی اور اس کا خواب ناک لہجہ مراد شاہ کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر رہا تھا۔ ''پیارے اللہ جی! بے شک تُو بڑا مہربان ہے۔ ہماری توقع سے بھی زیادہ۔'' بے حد دھیمی سی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی اور پھر ان کی دھڑکنوں میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ اس نے ان کے ہاتھ پر اپنا رخسار رکھ دیا تھا۔

وہ جیسے سحر زدہ سے رہ گئے تھے۔ انہوں نے سارہ کو بے حد چاہا تھا۔ اس سے شدید محبت کی تھی لیکن چاہے جانے کی طلب ہمیشہ انہیں بے کل کیے رکھتی تھی۔ اس کی طرف سے وہ محبت انہیں کبھی نہیں ملی تھی جو وہ چاہتے تھے۔ وہ مزاجاً بے حد مغرور اور خود پسند تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی بہن تھی اور بے انتہا محبتوں اور آسائشوں میں پرورش پانے کی وجہ سے محبتوں کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرنا اس کی عادت بن گئی تھی اور وہ اس بات کو محسوس تو کرتے تھے، ملول بھی ہوتے تھے لیکن ناراض ہونا یا احتجاج کرنا نہیں آتا تھا۔ ''زندگی جو ہے۔ جیسا ہے۔ ٹھیک ہے'' کے فارمولے کے تحت گزرتی جا رہی تھی۔ لیکن کل سے وہ جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔ ہوش و حواس سے ناتا بحال ہوتے ہی انہوں نے اپنے سیکرٹری عبدالمعز سے رابطہ کیا تھا اور اسے ضرورت کی دوسری چیزوں کا انتظام کر کے فوراً پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ انہیں شدت سے احساس تھا کہ سارہ پریشان ہو گی کیوں کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوتے تھے۔ دن میں کئی مرتبہ اسے فون کرتے تھے جبکہ اب دو دن گزر چکے تھے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ عبدالمعز کے پہنچتے ہی انہوں نے سارہ کا نمبر ملوایا تھا۔ پہلے تو وہ خفا ہونے لگی تھی کہ وہ دو دن سے کہاں تھے اور ان کا موبائل کیوں بند تھا۔ پھر شاید ان کی مکمل خاموشی نے اسے چونکا دیا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو۔'' ابھی انہوں نے جواب نہیں دیا تھا کہ ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''مراد صاحب! اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ سسٹر ماریہ! ان کی ڈرپ کب ختم ہوئی؟'' ان سے پوچھنے کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے سسٹر ماریہ کو مخاطب کیا تھا۔ تبھی یک دم مراد کو خیال آیا تھا کہ ان کا موبائل آن تھا۔

''سارہ پلیز! کچھ دیر رکو۔ میں ابھی کچھ دیر بعد کال کرتا ہوں۔'' انہوں نے جلدی سے موبائل عبدالمعز کی طرف بڑھایا تھا۔ ڈاکٹر کے کمرے سے نکلتے ہی انہوں نے سارہ کا نمبر ملوایا تھا۔ اس دوران وہ تیزی سے سوچ رہے تھے کہ انہیں سارہ سے کیا کہنا تھا۔ جو چند جملے اس نے سنے تھے اس سے وہ یہ تو یقیناً جان چکی ہو گی کہ وہ اسپتال میں تھے۔

''کیا ہوا مراد.....! آپ اسپتال میں کیوں ہیں؟'' ان کے ہیلو کہتے ہی اس نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔

''یوں ہی معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا سارہ! چیک اپ کے لیے اسپتال آیا تھا تو ایک پرانا دوست مل گیا۔ اس نے زبردستی دو تین گھنٹے سے آرام کے خیال سے روکا ہوا

ہے۔دو دن سے مسلسل میٹنگز نے بے حد تھکا ڈالا تھا۔سو میں نے بھی اس بہانے کو غنیمت جانا ہے۔'' ہلکے پھلکے سے انداز میں کہتے ہوئے وہ فوراً اس کی اور امان کی خیریت پوچھنے لگے اور پھر سے ہشاش بشاش لہجے میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے اسے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی تھی..... اور وہ مطمئن ہو بھی گئی تھی۔لیکن خود وہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئے تھے۔مایوسی اور اداسی کی دھند میں لپٹا موہوم سا انتظار ان کی جسمانی تکلیف کو کچھ اور بڑھانے لگا تھا۔بے شک سارہ کو وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں لیکن دل سے تو وہ چاہتے تھے کہ وہ آجائے اور یہ خواہش اس وقت کچھ اور زور پکڑ گئی تھی جب عبدالمعز نے کہا تھا۔

''سر! آپ میڈم کو بلوا لیتے۔آپ کی طبیعت سنبھل جاتی تو پھر چلی جاتیں۔'' اور وہ کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔وہ آسکتی تھی۔اس کے پاس امریکا کی پیشنلٹی تھی۔ویزے کا کوئی مسئلہ تھا نہ روپے پیسے کی کمی تھی۔

دل بھی عجیب شے بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے، جس کی محبت ایک بار اپنے اندر بسا لیتا ہے پھر چاہے وہ اس کو بار بار توڑے، مایوس کرے، یہ پھر بھی توقعات لگانا نہیں چھوڑتا..... مراد شاہ کا دل بھی ان کے ہزار روکنے کے باوجود ایک مرتبہ پھر سارہ شاہ سے توقع لگا رہا تھا۔شاید وہ آجائے۔آخر یہ تو اسے پتا چلا تھا کہ وہ اسپتال میں تھے، ان کو ڈرپ لگی ہوئی تھی۔باقی رہی ان کی بات کہ وہ خود کو ٹھیک ٹھاک کہہ رہے تھے تو یہ تو ان کی پرانی عادت تھی کہ وہ اپنی تکلیف کو حتی الوسع خود تک محدود رکھنے کی سعی کرتے تھے۔ اور یہ بات اتنے برسوں کی رفاقت میں سارہ شاہ کو جان لینا چاہیے تھی۔لیکن ہمیشہ کی طرح وہ نہیں جان سکی تھی، دل سے دل کو راہ والا نا تانہ سہی، عمر بھر کا رشتہ تو تھا۔ہمدم نہ سہی، ہم سفر تو تھی، مگر نہیں.....! وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں تھے۔انہوں نے بے حد اذیت کے عالم میں سوچا تھا۔اور اس ''کچھ بھی نہیں'' کو ثابت کرنے کے لیے بیتے لمحات، کئی بھولے بسرے واقعات ایک ایک کر کے یاد کے دریچے کھولنے لگے تھے۔

☆.....☆.....☆

اس دن وہ سارہ کے ساتھ اس کی پھوپو کے گھر کھانے پر مدعو تھے۔سارہ کے تینوں بھائی اور نوازانکل بھی اپنی فیملیز کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔یوں وہاں ایک چھوٹی سی تقریب ہو گئی تھی۔کھانے کے بعد وہ سارہ کے انکل اور بھائیوں کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے جب وہ اپنی پھوپو کی بیٹی لگی کے ساتھ لان میں چلی گئی تھی اور جیسے ماحول کی ساری خوب صورتیاں، ساری روشنیاں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔وہ اخلاقاً وہاں بیٹھے باتوں میں حصہ لیتے رہے تھے لیکن ان کا سارا دھیان اسی کی طرف تھا۔کچھ دیر وہ بمشکل سب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے تھے پھر سارہ کی سب سے چھوٹی بھابی ثمین سے اس کے متعلق پوچھا تھا اور اس نے شریر سی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا تھا۔

''وہ سامنے بیٹھی ہیں آپ کی بیگم صاحبہ.....'' ہنستے ہوئے لان کی طرف اشارہ کرتی وہ واپس پلٹ گئی تھی۔لگی جو کارڈلیس پر بات کر رہی تھی دھیمی آواز میں اسے کچھ کہتے ہوئے پچھلے لان کی طرف چلی گئی تھی۔سرخ گلاب کے پھولوں کی کیاری کے عین سامنے بیٹھی سارہ کوئی الگ ہی رہی تھی۔قوس قزح کے رنگوں والی ساڑھی کا عکس اس کے سجے سنورے، بے حد خوب صورت چہرے پر پڑ کر اسے کچھ اور دلکش بنا رہا تھا۔وہ چند لمحے تو جیسے مبہوت سے کھڑے اسے دیکھتے رہے تھے پھر سحر زدہ سے انداز میں اس کی جانب بڑھے تھے۔

''کیسی ظالم بیوی ہو یار! کتنی خوب صورت نظر آتی ہو اور دو گھڑی میرے پاس بیٹھنے کا بھی وقت نہیں ہے تمہارے پاس کہ تمہاری تعریف ہی کر سکوں۔بس اب چلو گھر چلیں۔'' انہوں نے بے حد وارفتگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''ابھی سے.....؟ ابھی تو لگی کی ٹیلی فلم آئے گی مراد! وہ دیکھیں گے۔'' ان کے جذبات سے بے خبر وہ جیسے حتمی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''یہ ٹیلی فلم تو اپنے بیڈ روم میں بیٹھ کر دیکھی جا سکتی ہے ڈیئر۔لیکن اتنے لوگوں میں بیٹھ کر اس قیامت خیز حسن کو خراج عقیدت تو پیش نہیں کیا جا سکتا نا.....!'' اس کے وجود سے اٹھتی بے حد دلفریب سی مہک نے انہیں بے خود کر دیا تھا۔''چلیں جاناں!'' بے حد پیار کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہوں نے سرگوشی نما لہجے میں کہا تھا۔

''نہیں مراد! میں ابھی نہیں جارہی۔'' اپنے ریشمی بال ایک جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے اس نے کچھ ایسے سرد اور اٹل لہجے میں کہا تھا کہ مراد شاہ ششدر سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ محبت اور چاہت سے لبریز ان کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا ہو۔ وہ شدید شاک کی کیفیت میں آگئے۔ اگر وہ معمول کی صورت حال میں ان کی کسی بات کو رد کردیتی تو وہ محسوس بھی نہ کرتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرنا اور پھر انا کا مسئلہ بنانا ان کی عادت نہیں تھی لیکن اس وقت وہ جس وارفتہ و والہانہ انداز میں اپنی محبت کا اظہار کررہے تھے۔ اس کے جواب میں اس کے سرد رویے نے انہیں شدید رنج و غم سے دوچار کیا ہی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی شدید تذلیل بھی محسوس ہورہی تھی۔ اور اس تذلیل سے بھی بڑھ کر اپنی محبت کے رد کیے جانے کا احساس تھا جو ایک گہری اذیت سے دوچار کررہا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ دھواں دھواں آنکھوں سے اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈتے رہے تھے۔ مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی خاص رنگ، نہ کوئی جذبہ اور ملال یا ندامت تو تب ہوتی جب اسے اپنے اس قدر برے رویے کا احساس ہوتا یا پھر ان کے جذبات و احساسات کا کچھ خیال ہوتا مگر اسے صرف اپنا خیال تھا۔ اپنی ذات کے حصار سے نکل کر کسی اور کے متعلق سوچنا یا کسی اور کی فکر کرنا اسے جیسے آتا ہی نہیں تھا۔

''مراد آپ کو پتا ہے اس ٹیلی فلم میں جس لڑکے نے لگی کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس نے لگی کو پروپوز کیا ہے اور لگی نے اسے کہا ہے کہ پہلے میری کزن سارہ سے ملو، اگر اس نے تمہیں او کے کردیا تو میں تمہارا پروپوزل قبول کرلوں گی۔'' اپنے کچھ دیر پہلے کے رویے اور ان کی کیفیت سے یکسر بے خبر وہ فخریہ لہجے میں بتارہی تھی۔

''مراد شاہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس کے بے حد خوب صورت چہرے کو دیکھا تھا دل میں ایک پھانس سی آچبھی تھی۔ کچھ کھودینے کے احساس نے من کو بے کل کردیا تھا، مگر کھونا کیسا! انہوں نے کچھ پایا ہی نہیں تھا۔ اس نے کب انہیں کہا تھا کہ وہ بھی اسے اچھے لگتے تھے۔ اس کا دل بھی انہیں دیکھ کر انوکھے سے انداز میں دھڑکا تھا۔ بہانے بہانے سے انہیں دیکھنے کے لیے مچلا تھا۔ پہلی بار ان کا دھیان اس رخ کی طرف گیا تھا جس پر سوچنے کی ان کی بے تحاشا محبتوں نے انہیں فرصت ہی نہیں دی تھی۔ اور اب جب دھیان اس طرف گیا تھا تو انہیں کئی باتیں یاد آنے لگی تھیں اور دل میں پھیلی ویرانی بڑھنے لگی تھی۔ شادی سے اگلے روز جب فور شوق سے اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

''سارہ! میں تمہیں پہلی ملاقات میں کیسا لگا تھا؟''

''بس ٹھیک ہی.....'' بے پروائی سے کہتے ہوئے وہ لپ اسٹک لگانے لگی تھی۔ ان کے پندار کو جیسے سخت ٹھیس لگی تھی لیکن اگلے ہی لمحے جب وہ اپنے ہوش ربا سراپا کے ساتھ ان کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی۔ ''مراد! یہ ذرا بریسلیٹ کا ہک تو بند کردیں۔'' وہ جیسے سب بھول گئے تھے۔

''کبھی کبھی انہیں خود پر حیرت ہوتی تھی۔ اپنی اس بے تابی پر، دل کی اس دیوانگی پر حیرت ہوتی تھی۔ کالج میں، یونی ورسٹی میں ایک سے ایک خوب صورت لڑکی ہوتی تھی لیکن انہوں نے کبھی کسی میں ایسی کشش محسوس نہیں کی تھی، لیکن سارہ تو جیسے مقناطیس کا کوئی ٹکڑا تھی کہ وہ اسے دیکھ کر اس کی طرف کھنچتے چلے گئے تھے۔ یا پھر یہ سب اس خیال، اس احساس کی وجہ سے تھا جس کے ساتھ وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ اور یہ احساس، یہ جذبہ ان کے دل میں شاید نواز انکل کی باتوں نے پیدا کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

مراد شاہ کا شروع سے ہی زمین داری کی طرف رجحان نہیں تھا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر وہ کاروبار کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے پلاننگ کررکھی تھی جس کا ذکر وہ وقتاً فوقتاً گھر میں بھی کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے زمین سے اپنا حصہ لینے اور اسے فروخت کرنے کی بات کی تو بڑے بھائی نے بھی اعتراض نہ کیا تھا۔ اماں بی کا خیال تھا کہ ایک بالکل نئے کام میں اونچ نیچ ہوسکتی تھی سو انہیں سمجھانے کی مقدور بھر کوشش کی تھی پھر ان کے اٹل ارادے کو دیکھتے ہوئے خاموش ہورہی تھیں اور وہ اپنے حصے کی زمین فروخت کرکے پنڈی آگئے تھے۔

پیسا اور تعلیم ان کے پاس تھی اور کام کرنے کا شوق اور لگن بھی..... اس لیے ان کے دل میں دور دور تک ناکامی کا کوئی خدشہ یا کوئی خوف نہیں تھا۔ پھر انہوں نے ہمیشہ جو کام

بھی کیا تھا شوق، لگن اور محنت سے کیا تھا اور کامیاب ہوئے تھے۔ انہیں کبھی یہ خدشہ نہیں ہوتا تھا کہ کہیں وہ ناکام نہ ہو جائیں بلکہ وہ ہر کام اس یقین کے ساتھ کرتے تھے کہ وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ اور واقعی کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔ ان کا یقین تھا کہ جب کسی چیز کے حصول کی دل سے خواہش اور کوشش کی جائے تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ مدد کرتا ہے۔ اسی آفاقی اصول کو زادِ راہ بناتے ہوئے انہوں نے چھوٹی سی ایک گارمنٹ فیکٹری سے ابتدا کی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا کاروبار ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں جا پہنچا تھا۔

ان دنوں وہ کسی کی شراکت کے ساتھ ایک اور فیکٹری لگانا چاہ رہے تھے جب ان کی ملاقات نواز ہاشمی سے ہوئی تھی۔ وہ پینتیس سال امریکا میں رہے تھے۔ گئے تو ملازمت کی غرض سے تھے لیکن پھر ایک پاکستانی خاتون سے شادی کر کے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ کئی سال کے بعد پاکستان شفٹ ہونا چاہا تو بیوی بچے رضامند نہ ہوئے۔ اب بیوی وفات پا چکی تھی۔ تینوں بیٹے اپنے اپنے گھر بار والے تھے اور اب وہ چاہتے تھے کہ سب سے چھوٹی اور اکلوتی بیٹی سارہ کی شادی پاکستان میں کر کے خود بھی یہیں آ جائیں۔ بہت سال ایک غیر ملک میں گزارنے کے بعد اب اپنی آخری عمر وہ اپنے ہی ملک میں بسر کرنا چاہتے تھے۔ پاکستان میں کاروبار شروع کرنے کے لیے انہیں ایک تجربہ کار ساتھی چاہیے تھا اور اس سلسلے میں انہیں ایک قریبی دوست نے مراد شاہ سے ملوا دیا جو ان دنوں کسی کی شراکت کے ساتھ ایک نئی فیکٹری لگانا چاہ رہے تھے۔

اور پھر کاروباری شراکت کے ساتھ ساتھ دونوں میں ایک گہری اپنائیت اور دلی قربت نے جنم لیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ نواز ہاشمی کا رویّہ ان کے ساتھ بے حد محبت اور شفقت لیے ہوتا تھا اور چونکہ مراد شاہ کے والد وفات پا چکے تھے تو فطری طور پر ان کی محبت اور شفقت انہیں ان کے بے حد قریب کرتی جا رہی تھی۔ جب وہ فارغ ہوتے تو بے تکلفی سے ان کے گھر چلے جاتے تھے اور ویسے بھی نواز ہاشمی کے گھر ان کے ملازمین کے علاوہ تھا ہی کون۔ دوسری طرف مراد شاہ بھی اکیلے ہی رہ رہے تھے۔ اماں بی کچھ دن رہتی تھیں اور پھر واپس چلی جاتی تھیں۔ یوں نواز ہاشمی کا اور ان کا بہت سا وقت اکٹھے گزرنے لگا تھا۔

اس دن بھی وہ ایک میٹنگ کے بعد ان کے گھر چلے آئے تھے۔ پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ وہ خشک میوہ سامنے رکھے میچ بھی دیکھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ اونچی آواز میں ہر اچھے شاٹ پر کھلاڑیوں کو داد بھی دے رہے تھے۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ کر ان کا ساتھ دینے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں میچ میں کھانے کا وقفہ ہو گیا تھا اور تب وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ متوجہ کیا ہوئے تھے بلکہ بغور انہیں دیکھنے لگے تھے۔ مراد شاہ ان کے اس طرح دیکھنے پر کچھ الجھ سے گئے تھے۔

"مراد! ایک بات پوچھوں بیٹے؟"

"جی ضرور پوچھیے۔"

"تم کہیں کمیٹڈ ہو؟" ان کی بالکل غیر متوقع سی بات پر چند لمحے تو وہ انہیں حیرت سے دیکھتے رہ گئے تھے۔

"نہیں انکل!" کچھ توقف کے بعد انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا اور وہ جیسے یک دم کھل اٹھے تھے۔

"مراد بیٹے! میری ایک ہی بیٹی ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو وہ میری اور تینوں بھائیوں کی بے حد لاڈلی ہے۔ بس یوں سمجھو ہم سب کی گویا اس میں جان ہے۔ ہماری محبتوں نے اسے تھوڑا سا خودسر بنا دیا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں اس کی شادی کسی ایسے لڑکے سے کروں جو محبت کرنے اور خیال رکھنے والا ہو اور تم بالکل ایسے ہی ہو۔ پھر اس تھوڑے سے عرصے میں تم دل کے اس قدر قریب آ گئے ہو کہ میری شدید خواہش ہے کہ تمہیں سچ مچ اپنا بیٹا بنا لوں۔ سارہ چند دنوں تک آ رہی ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو مجھے یقین ہے وہ تمہیں پسند آئے گی۔ بڑی فرصت سے بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے میری بیٹی کو۔" ان کے لہجے میں بیٹی کے لیے بے پناہ محبت تھی اور مراد شاہ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"کیوں مراد! تم اتنے حیران کیوں ہو بیٹے؟" انہوں نے بھی محسوس کر لیا تھا اور فوراً پوچھ لیا تھا۔

"کچھ نہیں انکل.....!" وہ جلدی سے سنبھلے تھے، ان کا تعلق جس علاقے اور خاندان سے تھا وہاں لڑکی کے رشتے کے لیے خود سے کہنا خاصا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر نواز ہاشمی کا تعلق ان کے علاقے اور خاندان سے تو نہیں تھا۔ انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے سوچا تھا۔

پھر وہ خاصی دیر سارہ کے متعلق باتیں کرتے رہے تھے اور جب مراد شاہ وہاں سے اٹھے تو سارہ ان کے لیے کوئی انجان لڑکی نہیں رہی تھی۔ وہ کیا کرتی تھی۔ اس نے کیا پڑھا تھا، اس کے کیا کیا مشاغل تھے۔ وہ سب کچھ جان چکے تھے۔ شادی انہوں نے شہر میں ہی کرنی تھی، یہ انہوں نے سوچ رکھا تھا اور اس پر اماں بی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اولاد کی خوشی میں خوش رہنے والی خاتون تھیں۔ بہن بھائی بھی خوامخواہ دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرنے کے عادی نہیں تھے۔ اور جب ایک نئے خاندان کے ساتھ ہی رشتہ داری قائم کرنا تھی تو نواز ہاشمی صاحب کی فیملی بہترین تھی۔ اگر ان کی بیٹی انہیں پسند آ جاتی تو.....

''مجھے یقین ہے سارہ تمہیں پسند آئے گی۔ بڑی فرصت سے بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے میری بیٹی کو.....'' پُریقین لہجہ ان کی سماعت میں گونجا تھا اور پھر وہ نیند کی وادیوں میں کھونے تک اس کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔

''وہ کیسی ہوگی۔ سرو قد اور خوب سرخ و سپید رنگت کی مالک، کیونکہ نواز انکل دراز قد اور سرخ و سپید تھے لیکن بہروز ہاشمی کا رنگ تو گندمی تھا۔ ہوسکتا ہے وہ بھائی کی طرح ہو۔ جیسی بھی ہو رنگت سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن بد دماغ اور نک چڑھی نہیں ہونی چاہیے۔ مگر نواز انکل تو کہہ رہے تھے کہ وہ کچھ خودسر سی ہے۔ پھر تو مشکل ہو جائے گی۔ ہوں..... سوچنا پڑے گا۔'' یہ آخری بات تھی جو انہوں نے سونے سے قبل سوچی تھی۔

مگر یہ سوچنے والی بات اسے دیکھتے ہی غلط ثابت ہوگئی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی دل نے سوائے اقرار کے کچھ بھی اور کہنے اور سوچنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بے تحاشا خوب صورت تھی۔ شاید اس وقت تک دیکھی ہر دلکش اور خوب صورت لڑکی سے زیادہ خوب صورت اور اسے اپنی خوب صورتی کا پوری طرح احساس تھا۔ یہ اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اک ادائے بے نیازی سے اس نے ان کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا تھا اور دو چار رسمی باتیں کی تھیں اور پھر اندر چلی گئی تھی۔ لیکن ان کا دل اور چین و قرار اپنے ساتھ لے گئی تھی اور نگاہوں میں اک تشنگی اور پیاس چھوڑ گئی تھی۔ اپنی اس کیفیت پر وہ حیران بھی تھے اور مسرور بھی۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ اسے کیسے لگے تھے مگر انہوں نے نہیں پوچھا تھا اور سیدھے سادے طریقے سے نواز انکل سے کہہ دیا تھا کہ وہ سارہ سے اس کی مرضی پوچھ لیں۔ اگر وہ راضی ہے تو وہ گاؤں سے اپنی اماں بی کو لے آئیں۔ نواز انکل بے حد خوش ہوئے تھے اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ سارہ سے بات کر چکے ہیں۔ مراد شاہ کو ان کی اس بات پر پہلے تو حیرت ہوئی تھی لیکن پھر یہ حیرت خوشی کے بے پایاں احساس کے نیچے دب کر رہ گئی تھی۔ وہ گھڑی کے چوتھائی پل میں اس سے کوئی مضبوط تعلق استوار کر لینا چاہتے تھے۔ اس لیے اسی شام اماں بی کو لینے لاہور روانہ ہو گئے تھے۔

پھر جیسے سب کچھ جھٹ پٹ ہو گیا تھا اور وہ بہار بن کر ان کی زندگی میں داخل ہوگئی تھی۔ وہ بے تحاشا خوش تھے اور اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھے۔ وہ سوچا کرتے تھے کہ انسان جو چاہے وہ پالے تو اس سے بڑا کوئی خوش نصیب نہیں، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی یہ سوچ بدلتی چلی گئی تھی۔ اب وہ سوچتے تھے کہ کیا وہ واقعی خوش نصیب تھے۔ کیا واقعی انہوں نے جو چاہا تھا، وہ پالیا تھا۔

''نہیں..... نہیں..... نہیں.....'' ان کے اندر جیسے کسی نے فوراً نفی کی تھی۔ مگر پھر وہ کیا چاہتے تھے، ان کی جستجو ان کی آرزو کیا تھی۔ ایک بے حد خوب صورت، من چاہی عورت ان کی شریک زندگی تھی اور وہ خوش نہیں تھے۔ آخر کیوں؟ کس لیے؟ اس کا جواب بہت آسان تھا۔ بہت واضح تھا مگر یہ جواب زندگی کی راہوں کو بہت مشکل بنا دینے والا تھا۔ سو انہوں نے اس سوال کو سوال ہی رہنے دیا تھا اور ایک دلکش مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے سارہ کے قدم سے قدم ملاتے اندر کی جانب بڑھ گئے تھے جہاں سارہ شاہ کی ماڈل کزن گلی کی بطور اداکارہ پہلی ٹیلی فلم کسی مشہور چینل سے دکھائی جانے والی تھی۔

پھر کتنی بہت سی رتیں آئی تھیں ٹھہری تھیں اور گزر گئی تھیں۔ کتنے ماہ و سال بیت گئے تھے اور اپنے پیچھے کئی تبدیلیاں چھوڑ گئے تھے۔ مگر نہیں بدلی تھی تو صرف سارہ شاہ نہیں بدلی تھی۔ کبھی تو وہ اسے نظر آئیں گے۔ کبھی تو اسے ان کی محبت نظر آئے گی، کبھی تو اس کے دل میں ان کی محبت بے دار ہوگی۔ یہ آس، یہ امید اب بھی قائم تھی۔ لیکن آج صبح اسپتال کے اس بستر پر لیٹے ہوئے انہوں نے سوچا تھا اب انہیں اس آس و امید کا دامن چھوڑ دینا چاہیے تاکہ بار بار ٹوٹنے اور بکھرنے کے اس عمل سے بچ سکیں جس نے

انہیں تھکا ڈالا تھا..... شاید اس وقت وہ کچھ زیادہ ہی زود رنج ہو رہے تھے۔

علی الصبح عبدالمعز کے گھر سے فون آیا تھا۔ اس کی والدہ سخت علیل تھیں اور اسے یاد کر رہی تھیں۔ انہوں نے اسے فوراً جانے کے لیے کہا تھا مگر وہ انہیں یوں اکیلا چھوڑ کر جاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

''سر! آپ تو جانتے ہیں کہ میں اپنی والدہ سے کتنی محبت کرتا ہوں لیکن آپ کو یوں چھوڑ کر جانے کو بھی دل نہیں مان رہا۔'' اس کے اندر کی کش مکش اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ آپ کا خیال میرے قدم جکڑ رہا ہے سر!'' انہیں اس وقت وہ ایک معصوم بچے کی مانند لگا تھا جو سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اسے کیا کرنا ہے۔ انہیں بے اختیار وہ منظر یاد آیا تھا جب وہ اپائنٹ منٹ لیٹر ہاتھ میں تھامے سرخ جھینپے جھینپے چہرے کے ساتھ کھڑا نظریں جھکائے کہہ رہا تھا۔

''سر.....! میری اماں کہتی ہیں اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی بھی نام ''عبد'' کے بغیر لکھنا اور پکارنا گناہ ہے۔ اس لیے پلیز.....! آپ مجھے عبدالمعز کہیے گا۔'

شاید اس وقت بھی اس کا چہرہ اس دن کی طرح سرخ ہو گا مگر وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔

''اور کیا وہ اب دیکھ سکیں گے.....؟'' انتہائی بے چینی کے عالم میں انہوں نے سوچا تھا اور ایک گہری اذیت کورگ و پے میں اترتا محسوس کیا تھا۔ پھر انہوں نے عبدالمعز کو اصرار کر کے بھیج دیا تھا۔ سسٹر ماریہ ناشتا کرنے اسٹاف روم میں چلی گئی تھی اور وہ کمرے میں اکیلے رہ گئے تھے۔ ہر سو خاموشی تھی..... ایک گہرا سکوت..... سوائے گھڑی کی ٹک ٹک کے کوئی آواز نہیں تھی اور یادوں کے دریچے خود بخود ہی وا ہونے لگے تھے۔ اور یادیں بھی وہ جو کچھ اور آزردہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے کئی سال پہلے اماں بی کو اپنی پسند سے شادی کرنے پر دلیل دیتے ہوئے کہا تھا۔

''اماں بی! ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس سے شادی کرے جس سے اس کا دل ملتا ہو اور اگر دل نہ ملے تو ذہن ضرور ملنا چاہیے اور اس پسماندہ گاؤں کی کسی لڑکی سے نہ تو میرا دل مل سکتا ہے اور نہ ہی ذہن۔'' مگر پھر جانے کیا ہوا تھا کہ وہ اپنی ہی بات بھول گئے تھے۔ زندگی کا ساتھی اسے چنا تھا جس سے نہ دل ملتا تھا نہ ذہن اور ستم ظریفی تو یہ تھی کہ جسے انہوں نے شریک سفر چنا تھا، محبت شاید اس کی خواہشوں میں کہیں آخری نمبر پر بھی نہیں آتی تھی جبکہ ان کے لیے غذا، ہوا اور پانی کی طرح زندگی کی اہم ضرورت تھی۔

''اسی لیے وہ دس سال سے محبت کے بغیر بھی زندہ تھے؟'' استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے انہوں نے جیسے خود ہی اپنا تمسخر اڑایا تھا۔ پھر انہوں نے ان کربناک سوچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے دھیان اِدھر اُدھر لگانا چاہا مگر کامیاب نہیں ہوئے تھے اور کامیاب ہوتے بھی تو کیسے.....؟ کمرے میں پھیلی بے پناہ خاموشی، دل کی دیواروں سے لپٹی اداسی اور مایوسی، تنہائی کا جان لیوا احساس، محبت اور خلوص کے رائیگاں جانے کا دکھ، بینائی کے کھو جانے کا خوف..... ایسے میں دھیان کے پردے پر وہی منظر لہرا رہے تھے، وہی عکس نظر آ رہے تھے جن کو وہ یاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''مجھے اس ضعیف ہسپانوی عورت نے حیران کر دیا تھا۔'' اسٹوڈنٹس.....!'' سرزمان کا پرجوش لہجہ ان کی سماعت میں گونجا تھا۔ ''میرے پوچھنے پر کہ آپ کے ساتھ کون ہے۔ اس نے انتہائی محبت بھرے لہجے میں بتایا کہ میرے شوہر۔''

''وہ کدھر ہیں؟'' میں نے حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد پوچھا تھا کیوں کہ وہاں دو تین آدمی تھے جو نوجوان تھے۔ تبھی خاتون کے جواب نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''میری یادوں میں.....'' مجھے محسوس ہوا شاید وہ ابنارمل ہیں لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ انہوں نے بتایا۔

''میں نے بیس سال کی عمر میں محبت کی شادی کی۔ ہم دونوں کے جذبے سچے تھے یا چند دن اکٹھے گزارنا ہماری قسمت میں تھے کہ ہماری شادی میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ شادی کے چند دن کے بعد میرے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ مگر میری یادوں میں وہ آج بھی زندہ ہیں۔''

"یعنی چالیس پینتالیس سال آپ نے صرف یادوں کے سہارے گزار دیے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔
"پچاس سال۔" اس نے فخریہ بتایا۔ "میرا دل کمال اطمینان سے تصحیح کرتی اس خاتون کی محبت اور عظمت کو سیلیوٹ کرنے کو چاہا تھا۔" سرزمان نے لیکچر کے دوران عورت کی محبت کی گہرائی کی مثال دیتے ہوئے کہا تھا اور اس بات نے مراد شاہ کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ برسوں گزرنے کے باوجود انہیں آج بھی سرزمان کا احترام سے لبریز لہجہ اور ان کے چہرے کا تاثر تک یاد تھا۔
"یقیناً ایسی لازوال محبت کسی خوش نصیب کے حصے میں ہی آتی ہے۔" آج ہی، صرف چند گھنٹے قبل اسپتال کے اسی کمرے میں سرزمان کی یہ گفتگو یاد آنے پر بے حد حسرت سے انہوں نے سوچا تھا..... اور اب جیسے یک دم ہی فضا کی صورت میں انہیں یہ خوش نصیبی میسر آ گئی تھی مگر اتنی بڑی بات وہ بھلا کس بناء پر سوچ بیٹھے تھے۔ مراد شاہ کو اپنی ہی سوچ پر حیرانی ہوئی تھی۔ ایک لڑکی جو اُن کے لیے یکسر اجنبی تھی۔ جس کے والدین بہن بھائی عزیز و اقارب کسی کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ جو انہیں زندگی میں پہلی بار ملی تھی۔ اور جب سے ملی تھی۔ حیران پر حیران کیے دے رہی تھی۔ اس کے بارے میں وہ اس حد تک جا کر کیسے سوچ رہے تھے؟
"شاید اس حادثے نے میرے جسم کے ساتھ ساتھ میرے ذہن کو بھی متاثر کیا ہے جو میں ایسی الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگا ہوں۔" انہوں نے دل ہی دل میں سوچ کر خود کو ڈپٹتے ہوئے گہری سانس لی تھی۔

☆.....☆.....☆

"آپ کس سوچ میں کھو گئے ہیں شاہ جی!" فضا کی آواز انہیں حقیقت کی دنیا میں کھینچ لائی تھی۔
"بس یونہی..... سوچ رہا تھا آخر کب سے تم مجھے جانتی ہو؟" انہوں نے خاصی بے دلی سے کہا تھا۔
"شاید ازل سے....." اس کی بہت دھیمی سی آواز اور خواب آگیں لہجہ انہیں پھر اپنی طرف مائل کرنے لگا تھا۔
"تمہیں علم ہے، تمہاری آواز اور لہجہ دونوں بے حد خوب صورت ہیں؟" بے اختیار ہی وہ کہہ گئے تھے۔
"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے شاہ جی! اگر آواز اور لہجہ بھی دلکش نہ ہوتا تو میں کیا کر لیتی لیکن پھر کوئی اور خوب صورتی ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بندے کو کسی نہ کسی خوب صورتی سے ضرور نوازتا ہے۔ میرا خیال ہے اب آپ کو سونا چاہیے زیادہ جاگنا آپ کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔" اپنی نرم انگلیاں دھیرے دھیرے ان کے بالوں میں پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔
"نہیں، ابھی مجھے نیند نہیں آ رہی۔" ان کا جھٹ سے کہنے کو دل چاہا تھا مگر بمشکل خود کو کہنے سے باز رکھا اور دل ہی دل میں خود کو ڈپٹتے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ ان کے سر کو سہلاتی رہی تھی اور جانے کس پل انہیں نیند آ گئی۔
پھر ان چند دنوں میں اس نے یوں انہیں چاہا تھا، اس قدر ٹوٹ کر محبت کی تھی کہ ان کی ساری زندگی کی تشنگی جیسے ختم ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتے تھے کہ بیماری اور تنہائی کے ان عذاب ناک دنوں میں اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو وہ کیا کرتے..... وہ تھی تو جیسے نہ کوئی تکلیف تھی، نہ پریشانی، حتیٰ کہ یہ خیال اور خدشہ بھی کہ پتا نہیں پٹی کھلنے پر وہ دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں، اس نے بھلا دیا تھا اور وہ اتنے یقین سے کہتی تھی۔
"آپ کی آنکھیں اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں شاہ جی! آپ بالکل فکر نہ کریں۔"
"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو فضا!" ایک دن انہوں نے پوچھ لیا۔
"مجھے اپنے اللہ پر بے حد یقین ہے۔ اس نے آج تک میری کوئی دعا رد نہیں کی۔" بے حد مان سے کہا گیا یہ جملہ انہیں متاثر کر گیا۔
اس دن سارہ کا فون آیا تھا اور ہمیشہ کی طرح فضا اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ جب کافی دیر گزر گئی اور وہ نہیں آئی تو وہ بے حد بے چین ہو گئے تھے۔ اچھے خاصے تکلیف دہ انتظار

کے بعد جب وہ آئی تو خاموش سی تھی۔

''فضا! کہاں رہ گئی تھیں؟ دوبار میں نے سسٹر ماریہ کو بھیجا تھا تمہیں دیکھنے کے لیے.....''

''اتنی دیر تو نہیں گزری شاہ جی!'' اس کی بھاری اور بھیگی بھیگی سی آواز پر وہ بُری طرح چونکے۔

''فضا! تم روتی رہی ہو؟'' ان کے دل کو جیسے کچھ ہوا تھا۔

''نہیں تو.....''

''جھوٹ مت بولو فضا! بتاؤ کیوں روئی تھیں؟''

''یونہی دل بھر آیا تھا۔''

''یونہی تو کچھ نہیں ہوتا۔'' آہستگی سے کہتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ضبط کی طنابیں جیسے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ ان کے ہاتھ پر پیشانی ٹکائے وہ روتی چلی گئی۔ انہوں نے بے اختیار اسے بازوؤں میں لے لیا۔ انہیں اس کے رونے سے بے حد تکلیف پہنچ رہی تھی مگر انہوں نے اسے چپ نہیں کرایا تھا کیونکہ جانتے تھے اس وقت جو بات اسے رُلا رہی ہے وہ ان کو نہیں بتائے گی اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا دوسرا راستہ صرف آنسو ہی تھے۔

''آج شام آپ کی آنکھوں کی پٹی کھل جائے گی نا؟'' وہ اک اضطراب اور کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ انہوں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا' دونوں خاموش تھے لیکن یہ خاموشی بھی اپنے اندر گویائی رکھتی تھی۔

''جانتی ہو فضا! پٹی کھلتے ہی میں کسے دیکھنا چاہوں گا؟''

''کسے.....؟'' اس نے آہستگی سے پوچھا۔

''صرف تمہیں.....!'' انہوں نے کہا اور اپنے ہاتھ پر گرتے انمول آبی قطروں کو لبوں سے چھو لیا تھا' نمکین سا ذائقہ ان کے پورے منہ میں گھل گیا اور ایک عجیب سی طمانیت' انوکھی سی سرشاری ان کی رگ رگ میں پھیل گئی تھی۔

ان کے ہاتھ کو اپنے نرم و گداز ہاتھوں کی گرفت میں لیے وہ بار بار اپنی آنکھوں سے لگاتی اور ان کی عمر بھر کی تشنگی جیسے اس کے آنسوؤں میں بہتی جا رہی تھی۔ کسی کے لیے اس قدر اہم ہونے کا احساس بہت انوکھا اور خوش کن تھا' بے حد مسرور اور مغرور کر دینے والا۔

''دیکھنے کے قابل تو سارہ باجی ہیں' مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں شاہ جی!'' کئی لمحوں کے بعد اس نے دھیرے سے کہا۔

''حُسن شکلوں میں نہیں' دیکھنے والی نگاہ میں ہوتا ہے فضا! اور تم نے بھلا سارہ کو کب دیکھا ہے؟''

''بہت بار.....''

''کہاں.....؟''

''آپ کے ساتھ۔'' تبھی ڈاکٹر ان کو چیک کرنے کے لیے آ گئے تھے اور ان کو بات ختم کرنی پڑی تھی۔ پھر ان کی پٹی کھل گئی تو انہوں نے فضا کو دیکھا تھا۔ اس نے پورا چہرا سیاہ چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

انہوں نے ایسی آنکھیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں جو بہ یک وقت ہنس بھی رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں..... جو بے تحاشا پیار لٹا رہی تھیں..... نثار ہوئی جا رہی تھیں..... وہ آنکھیں جو آئینہ تھیں اور اس آئینے میں ان کا ہی عکس تھا۔ وہ بے خود سے ان آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بہت کہا تھا کہ وہ چہرے سے چادر ہٹا دے لیکن وہ نہیں مانی تھی۔

''اس چہرے میں ایسا کچھ نہیں ہے شاہ جی! جو دیکھ کر آپ خوش ہوں۔ اصرار کر کے مجھے شرمندہ مت کریں۔'' اس نے کچھ اس انداز میں کہا تھا کہ وہ خاموش ہو گئے تھے۔
پھر جب انہوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ماں جی کے پاس جا رہے تھے تو وہ خاموش سی ہو گئی تھی۔
''کیا بات ہے فضا! کیا تم میری ماں جی سے ملنا نہیں چاہتیں؟'' انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''ایسی بات نہیں ہے شاہ جی! دراصل آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا اور اس کی بھاری ہوتی آواز اور سرخ آنکھوں نے اس کی گواہی دی تھی۔
''تو ٹھیک ہے۔ آج کی رات ہم ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں' صبح چلے چلیں گے۔'' انہوں نے فوراً اپنا پروگرام بدل دیا اور وہ گیلی ہوتی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔
پہلے انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ وہ واقعی اس قدر بدصورت ہے جتنا کہتی ہے لیکن جب اس نے مسلسل چہرا چھپائے رکھا اور کھانا بھی علیحدہ کمرے میں کھایا تو انہیں یقین کرنا پڑا لیکن یہ کوئی ایسی پریشان کن بات نہیں تھی۔ چہرے کی سرجری کروائی جا سکتی تھی اور یہ کام وہ فوراً کرنا چاہتے تھے۔
رات گئے گھپ اندھیرے میں جب وہ بے خبر سو رہی تھی۔ ان کی اچانک آنکھ کھل گئی تو دل چاہا کہ وہ لائٹ جلا کر اس کا چہرا دیکھ لیں لیکن چونکہ اس نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس لیے انہوں نے بمشکل خود کو روکے رکھا لیکن دل میں انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ صبح سب سے پہلے فون کر کے سیکریٹری کو اس کے چہرے کی سرجری کے فوراً سے پیش تر انتظامات کرنے کے لیے کہیں گے مگر اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔
صبح وہ بیدار ہوئے تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ انہوں نے واش روم کے دروازے پر نگاہ ڈالی تھی جو کھلا ہوا تھا۔ تبھی ان کی نگاہ تکیے کے ساتھ رکھے اپنی ڈائری میں سے پھاڑے ہوئے ایک صفحے پر پڑی تو وہ بُری طرح چونکے۔ کسی انجانے سے احساس کے تحت ان کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا تھا۔ تیزی سے انہوں نے وہ کاغذ سیدھا کیا اور پھر بُری طرح چونکے۔
''شاہ جی!
خدا کرے آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ دل تو چاہتا ہے خاک بن کر آپ کے قدموں سے لپٹ جاؤں' راکھ بن کر آپ کے اردگرد بکھر جاؤں۔ مگر آپ سے دور نہ جاؤں لیکن دل کا کیا ہے' دل تو بہت کچھ چاہتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے شاہ جی کہ انسان بہت ناشکرا ہے' اس کی خواہشات کا دائرہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے' ورنہ مجھے تو اتنا کچھ ملا ہے جو میں خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ وہ دن جو آپ کی قربت میں بسر ہوئے میرے لیے سرمایۂ حیات ہیں۔ زندگی ان دنوں کی یاد کے ساتھ گزار دینا میرے لیے قطعاً مشکل نہیں' بس آپ سے ایک ہی التجا ہے اگر آپ مان سکیں تو..... کہ خدارا اپنا نام مجھ سے مت چھینیے گا۔

اللہ نگہبان
ہمیشہ آپ کی خوشیوں کے لیے دعا گو
دل و جان سے آپ کی
''فضا''

چند لمحے تو وہ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں ساکت و صامت سے بیٹھے رہے تھے پھر جیسے ان کے جسم میں بجلی سی بھر گئی تھی۔ سلیپنگ گاؤن کی ڈوریاں باندھتے وہ تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھے تھے' پھر سارا دن وہ پاگلوں کی مانند اسے ڈھونڈتے رہے تھے لیکن وہ نہیں ملی تھی۔ وہ بادِ بہاری کے سبک خرام جھونکے کی مانند سکون و طمانیت اور فرحت و راحت کا احساس بن کر ان کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اور کبھی نہ ختم ہونے والی بے چینی و بے قراری اور رنج و ملال دے کر نکل گئی تھی۔ وہ کون تھی.....؟ کہاں سے آئی تھی.....؟ انہیں کیسے جانتی تھی.....؟ اور اس حد تک کہ محبت کرنے لگی تھی.....؟ بلکہ محبت بھی نہیں' وہ تو عشق تھا..... اور عشق بھی ایسا جس میں انسان فنا ہو جانے کی خواہش

کرنے لگتا ہے لیکن پھر وہ ان کی زندگی سے کیوں نکل گئی۔ وہ سوچتے تھے اور حیران ہوتے تھے اور بے کلی تھی کہ بڑھتی چلی جاتی تھی۔ بے قراری تھی کہ ہر دم مضطرب کیے رکھتی تھی۔

عجیب لڑکی تھی' خود تو پاگل تھی انہیں بھی پاگل بنا گئی تھی۔ کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ یہاں تک کہ سارہ کی پُرسحر سنگت بھی اب جیسے کوئی کشش نہیں رکھتی تھی۔ وہ ان کے سامنے ہوتی تھی لیکن وہ فضا کے بارے میں سوچ رہے ہوتے' اس کی محبتیں' اس کی شدتیں' اس کی وارفتگی کچھ بھی تو بھولنے والا نہیں تھا۔ دن تو جیسے تیسے گزر جاتا لیکن رات کو اس کی یادیں سونے نہیں دیتی تھیں۔ اب تو سارہ بھی ان کی بے توجہی کا گلہ کرنے لگی تھی اور ان کی بے دھیانیوں پر چڑنے لگی تھی۔ اس دن تو ان کی اچھی خاصی تلخی ہوگئی تھی۔ وہ ایک اسکول کے افتتاح کے لیے مدعو تھے۔ یہ اسکول ان کے دوست ریحان صاحب کی بیٹی نے قائم کیا تھا۔ جہاں غریب بچوں کی مفت تعلیم کا انتظام تھا۔ یونیفارم' کتابیں' کاپیاں اور بیگ ہر چیز مفت تھی۔ چند دن پہلے انہوں نے اسکول کے لیے دو لاکھ کا چیک دیا تھا جس پر سارہ اچھی خاصی چراغ پا تھی۔ اسی لیے جب انہوں نے افتتاح کے لیے مراد شاہ اور اسے مدعو کیا تو پہلے تو وہ جانے کے لیے ہی تیار نہیں تھی اور جب ان کے اصرار پر تیار ہوگئی تو ان کی بے نیازی نے اس کی نسوانیت کو بُری طرح مجروح کیا تھا اور وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔

''آخر آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے' ہر وقت ماتمی صورت بنائے جانے کہاں گم رہتے ہیں۔ میں تو جیسے آپ کو نظر ہی نہیں آتی' آخر کیوں.....؟'' ہینڈ بیگ غصے سے بیڈ پر پھینکتے ہوئے وہ چیختی ہوئی ان کی قریب آئی۔

انہوں نے موبائل سے نگاہیں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ اورنج پیور سلک کی ساڑھی' اورنج پھولوں والے آف وائٹ سلیولیس بلاؤز میں ملبوس' پرل کی جیولری اور بے حد مہارت سے کیے ہوئے میک اپ میں وہ ہوش اڑا دینے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ کبھی یہ حسن ان کو سحر زدہ کر دیا کرتا تھا۔ ان کی نگاہوں کو جکڑ لیا کرتا تھا مگر اب ایسا کچھ نہیں ہوا تھا اور ان کی یہی بے اعتنائی سارہ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی پھر وہ کافی دیر یونہی چیختی رہی تھی۔ انہوں نے پہلے تو اسے راضی کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کسی طرح جانے پر آمادہ نہ دیکھ کر خود چلے گئے تھے..... پھر یہ سب جیسے اکثر و بیش تر ہی ہونے لگا تھا۔ سارہ کو شبہ تھا کہ شاید وہ کسی اور میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن کس میں؟ اچھی خاصی چھان بین کے باوجود بھی اسے کوئی سراغ نہیں ملا لیکن اس کا شک دور نہیں ہوا تھا اور ہوتا بھی کیسے..... وہ جو ہر آن' ہر گھڑی اس کے اردگرد رہا کرتے تھے' پروانہ وار اس پر نثار ہوا کرتے تھے۔ اب جیسے وہاں ہوتے ہوئے بھی کہیں اور ہوتے تھے' لیکن کہاں.....؟ وہ یہی سوچ سوچ کر کڑھتی اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتی تھی۔

وہ موسم بہار کا ایک بے حد خوب صورت دن تھا لیکن باہر کے سارے موسم تو دل کے تابع ہوتے ہیں اور ان کے دل کا موسم تو جیسے ہمیشہ کے لیے خزاؤں کی زد میں آ چکا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی و بے قراری ہمہ وقت دل و روح کا احاطہ کیے رہتی تھی۔ اس دن بھی وہ ایسی ہی کیفیت میں کب سے فائلیں سامنے رکھے بے زاری سے بالوں میں انگلیاں الجھائے خود کو کام میں مصروف کرنا چاہ رہے تھے مگر جانے کیا وجہ تھی کہ آج کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کافی دیر وہ یونہی بیٹھے رہے تھے بالآخر تنگ آ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سست روی سے گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب ایک آدمی ان کی راہ میں آ کھڑا ہوا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا' پھر حیران ہو اٹھے تھے' اس کے ہاتھ میں ایک سفید لفافہ اور آغوش میں چادر میں لپٹا ہوا ایک بچہ تھا۔ اس کا چہرا نظر نہیں آ رہا تھا لیکن لپیٹنے کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ چند دنوں یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہوگا۔ اس آدمی نے لفافہ ان کی طرف بڑھایا۔

''مہربانی کر کے آپ اسے پڑھ لیں۔''

لفافہ تھامتے ہی ان کے دل میں جیسے بھونچال سا آ گیا تھا۔ اندر باہر گویا چیخ پکار سی مچ گئی تھی۔

''فضا..... فضا..... فضا.....!''

تیزی سے لفافہ کھولتے ہوئے انتہائی بے چینی و بے قراری سے انہوں نے کاغذ سیدھا کیا اور بے تابی سے اپنی نگاہیں لفظوں پر دوڑانے لگے۔

"دل و جان سے عزیز شاہ جی!
ہمیشہ خوش رہیں۔ مسکراتے رہیں۔
جس وقت آپ کو میرا یہ خط ملے گا میں ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکی ہوں گی۔ کچھ لوگوں کے مقدر میں یوں سفر لکھ دیا جاتا ہے کہ پھر ایک جگہ ٹھکانا ممکن ہی نہیں رہتا۔ میرا بے شک کوئی گھر نہیں' کوئی در نہیں' کوئی آسرا' کوئی سہارا نہیں' کوئی سنگی' کوئی ساتھی نہیں' لیکن پھر بھی آج میں خوش ہوں' بے حد خوش۔ یہ تحفہ جو میں آپ کو دے رہی ہوں' اس سے انمول میرے پاس کوئی شے نہیں۔ اگر ہوتی تو وہ بھی آپ کی نذر کر دیتی۔ گزشتہ سال عید پر ایک یتیم خانے کے بچوں میں کپڑے اور جوتے تقسیم کرتے ہوئے آپ کی اور سارہ جی کی تصویر اخبار میں چھپی تھی اور اس تصویر کو تراش کر اپنے تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے میں نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد کی نعمت عطا فرمائے..... اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ اللہ میری دعاؤں سنے گا کہ آپ کی زندگی کی یہ کمی دور کرنے کے لیے مجھ ناچیز کو ہی منتخب کر لے گا اور یہ میرے لیے کتنا بڑا اعزاز ہے شاہ جی! شاید آپ کبھی نہ جان سکیں لیکن میں نے آپ کو کتنا چاہا ہے' کتنا سوچا ہے' اس کا ثبوت اس ننھے وجود کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ اس کی آنکھیں' اس کی ناک' اس کے لب' سب کچھ آپ سے مشابہہ ہے یا پھر مجھے ہی ہر سو آپ ہی آپ نظر آتے ہیں۔
ہر دم' ہر گھڑی آپ کی خوشیوں کے لیے دعا گو!

"فضا"

"صاحب جی! یہ آپ کی امانت....." آخری لفظوں پر نگاہ جمائے وہ گم صم سے کھڑے تھے جب ان الفاظ نے انہیں چونکا دیا۔ وہ چادر میں لپٹا ننھا سا وجود ان کی طرف بڑھائے کھڑا تھا۔ بے اختیار ان کے بازو آگے بڑھے اور انہوں نے اسے تھام لیا تھا۔ دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے اور دل میں جیسے تلاطم سا برپا تھا۔
"فضا کہاں گئی ہے بابا جی! آپ کو تو کچھ پتا ہو گا؟" دل نے خوش فہمی کی ردا اوڑھتے ہوئے یہ پوچھنے پر مجبور کیا تھا۔ انہوں نے حقائق سے نگاہ چراتے ہوئے بڑی امید سے ان کی جانب دیکھا تھا۔
"نہیں..... آج صبح کچھ بھی بتائے بغیر چلی گئی۔"
"کہاں گئی ہو گی وہ.....؟" بمشکل ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
"پتا نہیں.....!"
"سنیں بابا جی!" انہیں جاتا دیکھ کر وہ جلدی سے آگے بڑھے۔ "آپ کی فضا سے کیا رشتہ داری ہے؟"
"وہ میری چچازاد بہن کی پوتی ہے۔"
"تو آپ کو یہ اندازہ تو ہو گا کہ وہ کہاں گئی ہو گی؟"
"نہیں' میں نے پوچھا تھا لیکن اس نے ٹال دیا۔ شاید اس لیے کہ وہ آپ کو بے خبر رکھنا چاہتی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اسی شہر میں ہے کیونکہ ایک بیگم صاحبہ اس سے کپڑے سلوانے آئی تھیں' انہوں نے کہا تھا کہ ان کی بہن کے پاس جگہ ہے' وہ وہاں رہ جائے اور ان کی بیٹیوں کے کپڑے سی دیا کرے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے کہا تھا اور خدا حافظ کہتے ہوئے چلا گیا۔ وہ شکستہ اور نڈھال سے بمشکل اپنی ٹانگیں گھسیٹتے گاڑی میں آ بیٹھے تھے۔
"وہ کہاں گئی ہو گی اور اتنے بڑے شہر میں وہ کیسے اسے ڈھونڈ سکتے تھے۔" بے حد مضطرب سے وہ سوچ رہے تھے اور تبھی ان کی بانہوں میں سمٹے وجود میں حرکت ہوئی اور پھر رونے کی آواز پر انہوں نے ہر جذبے سے خالی' اداس آنکھوں سے اس صورت کو دیکھا تھا اور ان کی نگاہ اس کے نقوش پر جم کر رہ گئی تھی۔ ان کے سامنے جیسے ان کی اپنی تصویر تھی۔ وہی آنکھیں' وہی پیشانی' وہی ناک' وہی لب۔

''یقین آیا میری چاہت کا.....؟'' جیسے قریب ہی کہیں سے سرگوشی اُبھری اور وہ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگے تھے۔ وہ ہوتی تو وہ اسے بتاتے کہ یقین تو انہیں پہلے بھی تھا لیکن وہ نہیں تھی اور جانے کہاں ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ تنہا اور بے سہارا..... یہ خیال کس قدر تکلیف دہ تھا۔ نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ انہوں نے اس ننھے وجود کو سینے سے لگا کر بھینچا اور وہ حیرت انگیز طور پر فوراً خاموش ہو کر ٹکر ٹکر انہیں دیکھنے لگا تھا۔ انہوں نے آہستگی سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا اور دل میں جیسے محبتوں کے سوتے اُمڈتے محسوس ہوئے تھے۔ اس کے وجود سے اُٹھتی مانوس سی مہک نے انہیں جیسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ دیوانہ وار اس کے روئی کے گالوں جیسے رخساروں پر پیار کرتے چلے گئے تھے۔

پھر انہیں یہ ننھا سا' گل گوتھنا سا وجود' جس کے اک اک نقش میں ان کی شباہت جھلکتی تھی' سارہ شاہ کے حوالے کرنے کے لیے کیسے کیسے جتن کرنے پڑے تھے' یہ وہی جانتے تھے۔ انہوں نے سوائے اس حقیقت کے کہ فضا ان کے لیے کیا حیثیت رکھتی تھی' سب کچھ نپے تلے انداز میں بتا دیا تھا۔ اس کے بعد ان کی تلاش میں کچھ اور شدت آ گئی تھی۔ کہاں کہاں نہیں کھوجا تھا انہوں نے اسے' سالوں گزر گئے تھے لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے تھے' اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا لیکن وہ تھکنے ضرور لگے تھے اور اب جب وہ اچانک انہیں مل گئی تھی تو وہ اسے کسی انمول اور نایاب خزانے کی مانند بڑی حفاظت کے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ اس کی ساری محبتوں اور عنایتوں کا قرض چکانا چاہتے تھے۔ مدتوں سے پیاسے من کو سیراب کرنا چاہتے تھے۔

☆.....☆.....☆

انہوں نے آہستگی سے اس کی لمبی پلکوں والی غلافی آنکھوں کو چھوا تھا اور اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو انہوں نے یکدم اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''فضا! تم کہاں چلی گئی تھیں؟ میں نے بہت ڈھونڈا تمہیں' پاگلوں کی طرح ہر طرف تمہیں کھوجتا پھرا' گلیوں میں' بازاروں میں' سڑکوں پر' تم کہاں چھپ گئی تھیں؟'' وہ والہانہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے انتہائی بے چینی و بے قراری سے کہہ رہے تھے اور وہ لرزتے ہونٹوں اور بہتی آنکھوں کے ساتھ انہیں سن رہی تھی۔ ''فضا! کیوں کیا تم نے ایسا؟''

''آ.....پ..... کے لیے..... آپ کی خوشی کے لیے.....'' ان کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی۔

''میری خوشی.....؟'' انہیں جیسے اس کی نادانی اور کم فہمی پر تاسف ہوا اور وہ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آپ سارہ باجی کے ساتھ بے حد خوش تھے اور میں آپ کی ازدواجی زندگی کو درہم برہم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے کہاں خبر تھی کہ آپ مجھے یاد کر رہے ہیں' میری کمی محسوس کر رہے ہیں۔''

''کیوں نہیں آیا تمہیں یہ خیال' جب کہ محبت میں تو دل کو دل سے راہ ہوتی ہے؟'' انہوں نے جیسے شکوہ کیا۔

''کیا میں اتنی خوش نصیب ہو سکتی ہوں شاہ جی!'' وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی جیسے کشمکش میں تھی۔

''تمہیں ابھی بھی یقین نہیں فضا؟'' انہیں جیسے سخت رنج ہوا۔

''اپنی کم مائیگی کا احساس یقین کی دیوار بننے لگتا ہے شاہ جی!''

''محبت جن کے لیے یوں اپنا دامن وا کر دے' وہ کبھی بے مایہ ہو سکتے ہیں؟'' انہوں نے بے حد چاہت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور وہ بے اختیار روتے ہوئے ان کے ساتھ لپٹ گئی۔

انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ اسے سینے سے بھینچ لیا اور دھیرے دھیرے اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہے تھے۔ بیتے دنوں کی داستان دہرا رہے تھے اور وہ ان کی محبتوں کی پھوہار میں بھیگتی مدہوش ہوئی جا رہی تھی۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ بزرگوں کی دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ دادی جو اٹھتے بیٹھتے اسے دعائیں دیا کرتی تھیں۔ اس کے

مقدر کے کھلنے کے لیے لمبے لمبے وظائف کیا کرتی تھیں۔ وہ سب دعائیں بار آور ہو گئی تھیں۔

''کاش دادی بھی زندہ ہوتیں اور یہ سب دیکھتیں.....'' اس نے بے اختیار سوچا اور لمحہ بھر کے لیے بُری طرح اداس ہو گئی لیکن مراد شاہ نے اسے زیادہ دیر اداس نہیں ہونے دیا۔

''دیکھا میرا پاگل پن..... تمہیں بخار ہے اور پتا نہیں کب سے تم نے کچھ کھایا نہیں اور میں ہوں کہ.....''

''مجھے تو بس آپ کی محبت چاہیے شاہ جی! میں میں سیر ہو جاؤں گی۔''

''جناب میں خود اور میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ تنگ پڑ جائیں گی آپ۔''

''تنگ پڑنے سے پہلے میں مر نہ جاؤں شاہ جی!''

''ہشت..... خوف ناک باتیں نہیں' اچھا اب تم اٹھو اور فریش ہو جاؤ پھر کھانا کھاتے ہیں۔'' وہ بیڈ پر سے اُترتی ہوئی ٹھٹک کر گئی اور سحر زدہ سی چاروں طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس نے کہاں دیکھا تھا یہ سب کچھ..... حقیقت تو دور کی بات تھی' اس کے تو خواب میں بھی کبھی ان چیزوں کا گزر نہیں ہوا تھا۔ دیواروں کے رنگ' پردے' بیڈ' ڈریسنگ ٹیبل' صوفہ' دبیز' قالین جس میں پاؤں دھنس رہے تھے۔ ہر چیز ایک دوسرے سے مکمل ہم آہنگ اور خوب صورتی اور دلکشی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھی۔ وہ جیسے مبہوت سی کھڑی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو فضا!'' انہوں نے بے حد نرمی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

وہ بُری طرح چونکی تھی اور پھر خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں کیا جواب دے۔

''اچھی آرائش اور امتزاج ہے نا!'' انہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا تو وہ بمشکل اثبات میں سر ہلا سکی۔

''سارہ کو ہمیشہ زبردست چیز ہی پسند آتی ہے۔ بے حد اعلیٰ ذوق ہے اس کا۔'' وہ کہہ رہے تھے اور وہ خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

پھر اچانک اس کی نگاہ اپنے کپڑوں پر پڑی' سستی سی لان کا گلابی پرنٹڈ سوٹ پہنے جو دھل دھل کر اپنی اصلی رنگت کھو چکا تھا' اپنے ملگجے سے حلیے میں اس چمکتے دمکتے بے حد آراستہ کمرے میں کھڑی وہ یقیناً بے حد عجیب لگ رہی تھی۔ اس کے پیلے پڑتے چہرے نے جیسے مراد شاہ کو سب کچھ سمجھا دیا تھا' انہوں نے بے حد نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما اور باتھ روم کی طرف لے گئے۔

''صرف پندرہ منٹ ہیں تمہارے پاس۔ ٹھیک سولہویں منٹ تمہیں میری نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیے۔ پہلے ہی انہیں بہت ترسایا ہے تم نے۔'' انہوں نے اس کے لیے واش روم کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''فضا! ایک منٹ پلیز۔'' اس کے دروازہ بند کرتے ہی اچانک کچھ یاد آنے پر وہ تیزی سے پکارے تھے۔ فضا نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں کھلا تھا۔ وہ پریشانی سے بار بار ہینڈل کو گھما رہی تھی مگر دروازہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

''فضا! دروازہ لاک ہو گیا ہے۔ ایک منٹ رکو میں چابی دیکھتا ہوں۔'' انہوں نے کہا تھا پھر ڈریسنگ ٹیبل کے دراز اور اِدھر اُدھر سب طرف دیکھ لیا تھا مگر چابی کہیں نظر نہیں آئی۔ ''فضا! غور سے میری بات سنو۔'' وہ باہر سے اسے تالا کھولنے کا طریقہ سمجھا رہے تھے اور اندر مارے شرمندگی اور ندامت کے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اپنا آپ اسے انتہائی بے مایہ اور حقیر لگ رہا تھا۔ ایک دروازہ تک تو اسے کھولنا نہیں آتا تو کیا وہ اس انتہائی خوب صورت اور شان دار گھر میں رہنے کے قابل تھی۔

''نہیں..... ہرگز نہیں' اس نے ہمیشہ حقیقت پسندی سے سوچا تھا اور یہ حقیقت بے حد تلخ اور روح فرسا سہی لیکن تھی تو حقیقت کہ اپنی تمام تر محبتوں اور شدتوں کے باوجود وہ

اس قابل نہیں تھی کہ مرادشاہ جیسے وجیہہ وشکیل اور پڑھے لکھے شخص کی بیوی کہلا سکتی۔اس خوب صورت گھر میں رہ سکتی۔

''فضا.....فضا.....! کیا ہوا۔تم دروازہ کھول نہیں رہیں؟'' اندر سے کسی قسم کی آواز نہ پا کر مرادشاہ نے بے چینی سے پکارا.....اور وہ اندر کیا کر رہی تھی' دروازہ کھولنے کی کوشش تک نہ کر رہی تھی۔

''فضا.....فضا.....!'' انہوں نے پھر اسے پکارا تھا اور جواب میں اس کی بھرائی ہوئی ''جی'' سن کر اچانک ہی انہیں سارہ سے چابی کے بارے میں پوچھنے کا خیال آیا تھا۔

جس وقت انہوں نے دروازہ کھولا اسے ان کی جانب دیکھا نہیں گیا تھا۔ندامت اور شرمندگی کی اک گہری دلدل تھی جس میں وہ خود کو دھنستا محسوس کر رہی تھی۔

''دراصل یہ ہینڈل میں کچھ پرابلم ہے' جلدی کھلتا نہیں ہے۔'' اس کے اُترے اُترے نادم سے چہرے کو پُرسوچ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ تھوڑی سی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اسے اس کیفیت سے نکالنے کی سعی کر رہے تھے۔فضا نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا پھر نگاہیں جھکا لی تھیں۔

''میں اب چلوں گی شاہ جی! بس ایک دفعہ امان کو مجھے دکھا دیں۔وہ اتنے دنوں سے کہاں ہے' باہر نظر کیوں نہیں آتا؟'' وہ دھیمے سے لہجے میں کہہ رہی تھی اور وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''تم کہاں جاؤ گی؟'' حیرانی سے انہوں نے پوچھا۔

''گھر.....''

''گھر تو وہ ہوتا ہے فضا! جہاں والدین اور بہن بھائی ہوں یا پھر شوہر اور بچے۔'' وہ جانے کس رو میں کہہ تو گئے تھے لیکن پھر فوراً ہی احساس ہوا تھا کہ یوں نہیں کہنا چاہیے تھا تب وہ جلدی سے سنبھلے۔''تمہارا گھر یہ ہے جہاں میں ہوں' تمہارا بچہ ہے۔'' اس نے ڈبڈباتی نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا پھر ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے بے حد تشکرانہ انداز میں گال کے ساتھ لگا لیا اور کئی لمحے خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں گزر گئے تھے۔

''میں خود کو اس قابل نہیں پاتی شاہ جی! بس اتنی مہربانی کریں کہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آجایا کریں اور امان کو بھی لے آیا کریں۔'' شدت ضبط سے نچلا لب دانتوں تلے دباتے ہوئے اس نے رک رک کر کہا۔

''میرا خیال یہ ہے کہ انسان نہیں جانتا کہ وہ کس قابل ہے' اس کے مقام کا تعین دوسرے کرتے ہیں اور تم نے اب تک بہت من مانی کر لی' اب تم وہی کرو گی جو میں چاہوں گا۔'' ان کے بڑے رعب سے کہنے پر فضا نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔''کرو گی نا.....؟'' اس کے کندھے پر بازو رکھتے ہوئے انہوں نے دھیمی سی آواز اور جذبوں سے گندھے لہجے میں پوچھا تو فضا کا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا تھا۔وہ اس قدر خوش نصیب بھی ہو سکتی ہے۔اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

''فی الحال تمہیں سارہ کے کپڑوں پر گزارا کرنا ہوگا۔شام کو ہم شاپنگ کے لیے چلیں گے۔'' انہوں نے الماری کھولتے ہوئے کہا۔

''اور سارہ جی؟ کیا وہ میرا وجود اس حیثیت سے برداشت کر لیں گی؟''

''کرنا پڑے گا لیکن فی الحال تو وہ اپنے بھائیوں کے پاس امریکہ گئی ہوئی ہے۔بس تم ساری فکریں چھوڑ کر یہ دیکھو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے بے اختیار ان کا ہاتھ تھام لیا۔

پوری الماری رنگا رنگ ملبوسات سے بھری ہوئی تھی۔اتنا ڈھیر! دھرتھا تو جانے وہ اپنے ساتھ کیا لے کر گئی تھیں۔اس نے حیرانی سے سوچا اور بھلا وہ ان میں سے کیا پہنے۔بغیر بازو کی قمیص اور گہرے گلے دیکھ کر اسے پسینہ آرہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ ٹھیک رہے گا۔'' آسمانی رنگ کی لان کی کڑھائی والی قمیص اور بڑے سے دوپٹے والا سوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے مرادشاہ نے اس کی مشکل آسان کرنی چاہی تھی۔فضا نے ایک لمحے کے لیے انہیں دیکھا تھا پھر ان کے ہاتھ میں تھامے ہوئے کپڑوں کو.....اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے' کیا کرنا

چاہیے لیکن پھر جیسے دل نے خود ہی فیصلہ دے دیا تھا۔ اسے وہی کرنا تھا جو مراد شاہ کہہ رہے تھے۔ اس نے ان کے ہاتھ سے ہینگر لیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

جب وہ باتھ لے کر آئی تو وہ فون پر کئی اہم معاملات نبٹا چکے تھے۔ جن میں سرفہرست کل تک ایک سجے سجائے گھر کا انتظام کرنا تھا اور فضا کی شخصیت نکھارنے کے لیے کسی تجربہ کار خاتون کا انتظام کرنا بھی' وہ چاہتے تھے کہ جب وہ سارہ کے سامنے آئے تو مکمل اعتماد کے ساتھ اور اس کے لیے اسے مکمل تربیت کی ضرورت تھی جو کہ یہاں مناسب نہیں تھی۔ ملازم ایک ایک بات نوٹ کر کے سارہ کو بتا سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک ماہ کے لیے علیحدہ گھر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب یہ ساری تفصیل انہوں نے فضا کو بتائی تو چند لمحوں کے لیے وہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔ پھر یک دم اس کی آنکھیں جھلملائی اور اگلے ہی لمحے باقاعدہ آنسو بہنے لگے تھے۔

''یہ کیا فضا.....؟'' وہ بُری طرح بے چین ہوئے۔

''یہ خوشی کے آنسو ہیں شاہ جی!'' بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے وہ مسکرائی تو مراد شاہ کو بہتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں کا یہ نظارہ اس قدر سحر انگیز لگا کہ چند لمحوں کے لیے وہ مبہوت سے اسے دیکھتے رہ گئے اور ان کی والہانہ نگاہوں پر وہ بُری طرح محجوب ہو کر رہ گئی تھی۔

آدھی آستین اور جدید تراش خراش کے ملبوس میں اسے ویسے ہی بے حد جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کہاں پہنے تھے اسے فیشن والے کپڑے۔ وہ خود کو خاصی بے اطمینان محسوس کر رہی تھی۔ جب وہ مارکیٹ جانے لگی وہ گھبرائی ہوئی سی بار بار مراد شاہ کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے فضا! تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' کچھ دیر تو وہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہے پھر آہستگی سے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''وہ دراصل..... میں کبھی مارکیٹ نہیں گئی اور پھر اس طرح..... میرا مطلب ہے' اس طرح کے لباس میں باہر جاتے ہوئے ہمیشہ میں منہ پر چادر لیتی رہی ہوں لیکن.....'' رک رک کر کہتے ہوئے وہ یک دم خاموش ہو گئی۔

''لیکن.....؟'' کچھ لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد مراد شاہ نے دُہرایا۔

''وہ چادر کافی پرانی ہے اور پھر آپ کے ساتھ.....'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیسے وہ انہیں اپنا مؤقف سمجھائے۔

''تم ایسا کرو' اسی دوپٹے کو چادر کی طرح اوڑھ لو۔ خاصا بڑا ہے یہ۔ مارکیٹ سے ہم اسکارف خرید لیں گے۔'' انہوں نے کہا تھا اور وہ جیسے خوشی سے کھل اٹھی۔

''آپ..... آپ بہت اچھے ہیں شاہ جی!'' ان کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرم جوش گرفت میں لیتے ہوئے اس نے بے حد عقیدت اور محبت سے انہیں دیکھا اور پھر ان کی محبت پاش نگاہوں سے گھبرا کر سرخ ہوتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''شادی کے شروع کے کچھ عرصے کے بعد میں کبھی سارہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے نہیں گیا۔ ہمیشہ وہ اپنی شاپنگ خود ہی کرتی رہی ہے۔ اس لیے خواتین کی شاپنگ کے معاملے میں بالکل اناڑی ہوں لیکن خیر آج یہ تجربہ بھی کرتے ہیں۔'' انہوں نے گاڑی پارک کرتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

''یہ یہاں کا مشہور اور بڑا اسٹور ہے۔ یہاں سے لیڈیز' جینٹس' چلڈرن گارمنٹس' کاسمیٹکس' جیولری' بیگز' جوتے' سویٹرز' شالز اور تقریباً سب کچھ مل جاتا ہے اور ہر چیز بہترین ہوتی ہے۔'' وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بتا رہے تھے۔

پھر جس وقت شاپنگ کے بعد واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھ رہے تھے کہ ان کے سیل کی پپ بجی۔

''جی زاہد صاحب!'' انہوں نے اسکرین پر نگاہ ڈالتے ہی فوراً فون اٹینڈ کیا تھا۔ ''بہت عمدہ' یہ تو زبردست خبر سنائی ہے آپ نے' اچھا پتا بتائیے ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔'' انہوں نے خوش گوار لہجے میں سیل آف کر کے اس سے کہا۔

''بوجھو فضا! ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''وہ..... آپ گھر کا بتا رہے تھے نا! تو شاید وہیں.....؟''

''ہوں..... میری فضا ہے تو ذہین.....'' انہوں نے ''میری'' پر زور دیتے ہوئے کہا تو وہ نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔

مراد شاہ سے اس کی آنکھوں کی نمی چھپی نہیں رہ سکی تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ چند لمحے خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے رہے تھے پھر آہستگی سے اسے مخاطب کیا۔

''فضا!'' تم میری بیوی ہو' میرے بچے کی ماں ہو' میں نے تمہیں صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ تم سے محبت بھی کرتا ہوں۔ اسی طرح تمہیں سب کے سامنے لا کر بھی کھڑا کر سکتا ہوں۔ لوگ کیا کہتے ہیں مجھے کسی کی پروا نہیں..... لیکن میری خواہش ہے کہ تم جب میری بیوی کی حیثیت سے سب کے سامنے آؤ تو لوگ تمہاری عزت کریں' تمہیں سارہ جتنی ہی اہمیت و عزت دیں اور خود تم اپنے آپ کو کسی طرح بھی سارہ سے کم نہ سمجھو اور تمہارا بیٹا تمہیں دیکھے اور تم سے ملے تو اسے اپنی ماں سب سے اعلیٰ' سب سے منفرد نظر آئے۔ مگر بار بار نم ہوتی تمہاری آنکھیں ظاہر کر رہی ہیں کہ تم شاید مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔''

''نہیں..... نہیں شاہ جی! ایسا نہیں ہے۔ میں آپ کے بارے میں ایسا کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ میرا اللہ کتنا مہربان ہے' آنکھیں تو اس کی مہربانیوں پر نم ہوتی ہیں اور کچھ دادی بار بار یاد آ رہی ہیں۔ یہ ان کی دی ہوئی دعائیں ہی ہیں جو آپ مجھے مل گئے۔ آپ کی محبت مل گئی۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں.....؟'' ان کے خفگی سے دیکھنے پر اس نے فوراً بات ادھوری چھوڑ دی۔

''درحقیقت اپنے بزرگوں سے دعائیں لیتے ہی خوش نصیب لوگ ہیں فضا! اور جو لوگ بے لوث محبت لٹاتے ہیں نا محبت بھی بڑی فراخدلی سے ان کے لیے اپنا دامن وا کر دیتی ہے اور چلیے جناب! یہ آ گیا آپ کا گھر.....'' انہوں نے ایک خوب صورت سے گھر کے دروازے پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ ان کے گاڑی روکتے ہی ایک آدمی دروازہ کھول کر تیزی سے آگے بڑھا تھا۔

''فضا! تم چلو گی یا گاڑی میں ہی بیٹھو گی؟''

''جیسے آپ کہیں.....'' اس کے فرماں برداری سے کہنے پر وہ بے ساختہ مسکرائے۔

''ٹھیک ہے' تم ابھی بیٹھو'' انہوں نے کہا تھا اور پلٹ کر اس آدمی سے ملے اور اس کے ساتھ اندر کی جانب چل دیئے اور وہ بے حد محبت کے ساتھ اس وقت تک انہیں دیکھتی رہی جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے تھے۔

اسے آج خود پر رشک آ رہا تھا۔ ساری کائنات بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ یہ سب کس قدر غیر متوقع اور انوکھا تھا۔ خواب میں تو اس نے خود کو ان کے سنگ چلتے' ان کے ساتھ رہتے' بہت بار دیکھا تھا مگر حقیقت میں یہ سب کیسے ممکن ہو گیا تھا اور کہیں یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا۔ جاگتی آنکھوں کا خواب پلک جھپکتی اور ختم ہو جاتا..... خدا نہ کرے! اس نے بے اختیار جھرجھری سی لی اور اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے لگی جس نے اسے اپنے من چاہے شخص کی سنگت اور محبت سے نوازا تھا۔ ورنہ وہ تو آسمان تھے اور وہ خود زمین آسمان اور زمین کا ملن کیونکر ممکن ہے لیکن بے شک وہ قدرت والا ربّ جس چیز کو چاہے ممکن بنا سکتا ہے۔

''فضا!'' سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکائے۔ مبہم سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ خوش کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی' جب ان کی دھیمی سی آواز اس سماعت سے ٹکرائی اور اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا بات ہے' سو گئی تھیں؟''

''نہیں تو.....'' وہ کھوئی کھوئی سی کیفیت میں انہیں دیکھتی ہوئی بولی۔

''فضا ڈیئر! یہ تمہاری قسمت ہے جو گھر کا فوراً انتظام ہو گیا' ورنہ میرا خیال تھا کہ کم از کم دو چار دن تو ضرور لگیں گے۔ آؤ تم بھی دیکھ لو تا کہ پھر فائنل کر دیں۔''

''آپ اس بندے کو فارغ کریں پھر اکٹھے اندر چلیں گے۔'' اس نے دھیمی سی آواز اور محجوب سے انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ محبت سے اسے دیکھتے واپس پلٹ

گئے۔

کچھ دیر کے بعد مراد شاہ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اس خوب صورت گھر میں داخل ہوتے ہوئے وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی اور تہہ دل سے اپنے ربّ کا شکر ادا کر رہی تھی۔

''شاہ جی! اگر سارہ باجی نے مجھے قبول نہ کیا تو.....؟'' ان کے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے اس کے دل میں ہلچل مچا تا خدشہ بے اختیار اس کے لبوں پر آ گیا۔

''آج ہم صرف اور صرف اپنی باتیں کریں گے۔ میری اور تمہاری اور کسی کی نہیں..... سمجھی!''

''اور امان کی؟''

''نہیں' آج صرف میں اور تم..... ویسے بڑی عجیب بات ہے فضا! کہ مجھے کبھی پتا ہی نہیں چلا کہ میں اس قدر رومینٹک ہوں۔'' انہوں نے قدرے شوخی سے کہا تو اس نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ ان ہی کی پشت پر چہرا چھپالیا تھا۔ تبھی باہر بیل ہوئی تھی اور وہ والٹ اٹھاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ لاؤنج میں داخل ہوئے تو ہاتھوں میں کئی شاپنگ بیگز اٹھائے ہوئے تھے۔ اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا تھا۔

''آیئے جناب! اپنا کچن بھی دیکھیے اور کھانا بھی نکالیے۔'' انہوں نے خوش دلی سے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہاتھ دھونے کے لیے اس نے سنک کا نل کھولتے ہوئے چور نظروں سے مراد شاہ کی طرف دیکھا جو شاپنگ بیگز میں سے کچھ نکال کر پلیٹ میں ڈال رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کیا تھا اور اس کا نام کیا تھا۔ وہ ہر چیز کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی اور اس کی حیرت بجا تھی۔ وہ دادی کے ساتھ جس گھر میں شروع میں رہتی تھی' وہاں صحن میں ایک طرف اینٹوں کا چولہا بنا ہوا تھا۔ جہاں لوگ لکڑیاں جلاتے تھے اور جسے ہر روز وہ مٹی کا ہاتھ پھیر کر صاف کر دیا کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ جس محلے میں گئے وہاں برآمدے میں ایک طرف گیس کا چولہا رکھا ہوا تھا اور ساتھ سمینٹ سے بنی ایک سلیب تھی۔ اسے مالک مکان' وہ اور دادی باورچی خانہ کہتے تھے یا پھر محلے میں خالہ سکینہ کے گھر میں ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ جہاں سوئی گیس کے دو چولہے اور ایک چھوٹی سی لکڑی کی الماری تھی۔ جہاں برتن وغیرہ رکھے ہوئے تھے اور اوپر سیمنٹ سے الماری نما جگہ بنی ہوئی تھی جہاں اوپر والے خانے میں ریت صابن سے چمکائی گئی دیگچیاں ہوتیں اور نچلے میں نمک مرچوں والے ڈبے۔ ان کا کچن اسے بڑا اچھا لگتا تھا مگر ایسا چمکتا دمکتا اور سجا سجایا کچن کہاں دیکھا تھا اس نے۔ اسے تو ان چیزوں کے نام بھی نہیں آتے تھے جو یہاں تھیں' استعمال کا طریقہ تو دور کی بات۔

عجیب اک احساسِ کمتری نے اسے آ گھیرا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر اپنا دھیان مراد شاہ کی طرف مبذول کر دیا تھا۔ وہ دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر لیے جلدی جلدی ہاتھ چلا رہے تھے اور وہ بغور انہیں دیکھتے ہوئے غور کر رہی تھی کہ وہ کیا کیا چیز کس برتن میں ڈال رہے تھے۔ کھانے کے بعد جب وہ برتن دھونے لگی تو انہوں نے اسے روک دیا تھا۔

''صبح سب کاموں کے لیے ملازمہ آ جائے گی۔ تم اب نماز پڑھ لو۔'' انہیں یاد تھا کہ وہ اسپتال میں پابندی سے نماز پڑھا کرتی تھی۔ وہ باتھ روم میں جانے لگی تو وہ جلدی سے اس کے برابر آ گئے تھے' اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا تھا۔

''میں ذرا ہاتھ دھولوں۔'' کہتے ہوئے وہ باتھ روم میں داخل ہو گئے تھے ابھی ابھی تو انہوں نے کچن میں ہاتھ دھوئے تھے۔ فضا نے کچھ الجھ کر انہیں دیکھا تھا۔ ''فضا یار! لاؤنج میں شاپنگ بیگ پڑا ہے' وہ جو ابھی ابھی بچہ دے کر گیا ہے' اس میں صابن ہو گا۔'' انہوں نے کہا تو وہ حیران تھی کہ آخر یہ سب چیزیں کیسے آ رہی تھیں اور صابن کھول کر انہیں پکڑاتے ہوئے آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''زاہد صاحب سے فون نمبر لے کر میں نے شاپ پر فون کیا تھا اور ضروری سامان لکھوا دیا تھا۔ یہ لوگ ہوم سروس بھی دیتے ہیں۔'' انہوں نے ہاتھ دھوتے ہوئے بتایا تھا۔

''فضا! واش روم کی کلر اسکیم اچھی ہے نا! اچھا دیکھو کموڈ میں پانی یوں گرائیں گے۔'' بے پروا سے انداز میں انہوں نے بتایا تھا اور وہ سمجھ گئی تھی کہ کچن میں ہاتھ دھونے کے بعد وہ

دوبارہ ہاتھ دھونے کس لیے آئے تھے۔اپنی طرف سے وہ اسے شرمندگی سے بچانا چاہ رہ تھے۔اسے اس لمحے وہ بے انتہا اچھے لگے تھے۔

نماز پڑھتے ہوئے اسے اپنے اللہ پر بے انتہا پیار آ رہا تھا۔جس نے اسے یوں نوازا تھا۔اس کا دل چاہا تھا کہ وہ خوب سارے شکرانے کے نوافل ادا کرے مگر اسے علم تھا کہ مراد شاہ اس کا انتظار کر رہے ہیں۔اس لیے دو نفل ادا کرتے ہوئے اس نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا اور باقی نوافل صبح پڑھنے کا ارادہ کرتے ہوئے مراد شاہ کی طرف بڑھی۔وہ فون پر بات کر رہے تھے۔اس نے پیچھے سے جا کر آہستگی سے تھوڑی ان کے سر پر ٹکا دی تھی۔

''سالگرہ مبارک ہو شاہ جی!اس بہت ہی اہم اور خوب صورت دن پر دینے کے لیے میرے پاس سوائے دعاؤں کے اور کچھ بھی نہیں۔لیکن ایک چیز اور ہے اگر آپ کو پسند آئے تو؟''اک انداز دلبرانہ'محبت اور چاہت سے لبریز مدھم سا'کومل سا لہجہ'مراد شاہ کو ایسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔بے حد سہانا خواب'بے حد دیرینہ خواب۔

بہن بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے۔والد بچپن میں وفات پا گئے تھے۔شوہر کی وفات کے بعد اماں بی تمام تر محبت کے باوجود انہیں وہ محبت اور توجہ نہیں دے پاتی تھیں'جس کی انہیں طلب تھی لیکن وہ بھی کیا کرتیں۔زمینوں کا حساب کتاب'گھر کی دیکھ بھال'میکے اور سسرال کی خوشی غمی اور پھر بچوں کی شادیوں کے سلسلے۔وہ یوں مصروف رہی تھیں کہ مراد شاہ پر زیادہ توجہ دینے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔گو اپنی ضروریات کے لیے انہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔گھر میں ملازموں کے علاوہ دو بڑی بہنیں بھی موجود تھیں پھر اماں بی ایک اچھی نگران تھیں۔گھر کا نظام احسن طریقے سے چل رہا تھا۔لیکن بھرپور توجہ اور محبت کی طلب جو ایک بار مراد شاہ کے دل میں پیدا ہوئی تو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی تھی اور زندگی کی مصروفیات نے والدین اور بڑے بہن بھائیوں کو یوں الجھایا ہوا تھا کہ کسی کو ان پر توجہ دینے کی فرصت تھی نہ ان کے وجود میں روز بروز بڑھتے اس خلا کی خبر۔

میٹرک کے بعد انہوں نے ہاسٹل جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو جمال بھائی اور اماں بی نے ان کی خواہش اور آسانی کی خاطر یہ بات بخوشی مان لی تھی کہ کالج گاؤں سے بہت فاصلے پر تھا لیکن مراد شاہ کے دل میں یہ بات پختہ ہو گئی تھی کہ کسی کو ان کی ذات میں دلچسپی تھی نہ ان کی ضرورت۔یوں آہستہ آہستہ وہ سب سے دور ہوتے چلے گئے۔

پھر بڑے شوق اور ارمانوں کے ساتھ سارہ سے شادی کرتے ہوئے ان کا خیال تھا کہ اب زندگی کی ہر کمی اور محرومیاں دور ہو جائیں گی۔کتنے خواب بنے تھے انہوں نے'مگر سب ایک ایک کر کے بکھر گئے تھے۔دل میں وہی تشنگی تھی'وہی تنہائی تھی'انہوں نے جسے چاہا تھا پا لیا تھا مگر پانے کے بعد پتا چلا تھا کہ طلب کچھ اور تھی۔عجیب المیہ تھا۔بہت محبت کی تھی انہوں نے سارہ شاہ سے اور بہت ترسے تھے خود محبت کے لیے'لیکن پھر انہوں نے خود کو سمجھا لیا تھا۔یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ شاید قسمت کی ستم ظریفی سے ان کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جو عمر بھر منتظر ہی رہتے ہیں۔محبت انہیں کبھی نہیں ملتی۔بھری بہار میں بھی ان کے من پر خزاں ہی چھائی رہتی ہے'ان کے دل کی کلی کبھی نہیں کھلتی'ایسے میں اب کیسے وہ یہ مان لیتے کہ محبت کا یہ بے کراں سمندر ان کے لیے تھا؟مراد شاہ کے لیے؟انہوں نے آزردگی سے سوچا اور پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ ٹھہری۔

تلاش بسیار کے بعد'بے حد انتظار کے بعد'انہیں یہ لمحات میسر آئے تھے اور ابھی کچھ دیر قبل تک وہ اس قدر خوش تھے کہ ان لمحات کو اپنی کسی تکلیف دہ سوچ یا خیال کی نذر کرنے کا گمان بھی نہیں کر سکتے تھے مگر کبھی انسان وہی کچھ کر جاتا ہے جس کا گمان بھی اسے نہیں ہوتا۔ویسے بھی اس بات کو جتنا بھی جھٹلایا جائے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان جو نئی نئی دنیاؤں کی تلاش میں رہتا ہے'بڑی بڑی فتوحات حاصل کر لیتا ہے'مگر کبھی کبھی اپنی ہی سوچیں اسے پسپا کر دیتی ہیں اور یوں کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی۔وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کسی ایسے تنکے کی مانند جسے پانی کی لہریں اپنی مرضی سے بہائے لیے جا رہی ہوں۔خیالات کے دھارے پر بہتا ہوا کہیں سے کہیں جا نکلتا ہے۔کچھ ایسا ہی اس وقت مراد شاہ کے ساتھ ہوا تھا۔

دل و دماغ پر تسلط جماتے اک خیال نے کہ یقیناً وہ کسی سے بے انتہا محبت کرتی تھی اور وہ شخص شاید مراد شاہ کے ساتھ بے حد مشابہت رکھتا تھا'زندگی کے کسی موڑ پر اس

سے بچھڑ گیا ہوگا اور ایسے میں جب وہ اسے نظر آئے تو وہ انہیں اس بچھڑ جانے والی محبت کا نعم البدل سمجھ کر دیوانہ وار ان کی طرف بڑھی ہو اور ان کو پانے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو گئی تھی تو گویا یہاں بھی مراد شاہ تو کہیں بھی نہیں تھے۔ اک زخمی سی مسکراہٹ سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی دل کو مضطرب کرتا یہ خیال سوال بن کر ان کے لبوں پر آ گیا۔

''فضا! پلیز..... اب اس معمے کو حل کر دو۔ بتا دو وہ وجہ جو تمہیں میری زندگی میں لائی ہے۔ وہ کون تھا اور کہاں گیا جو تمہاری چاہت تھا؟ جو مجھ سے اس حد تک مشابہت رکھتا تھا کہ تم مجھے بچانے کے لیے خون کا آخری قطرہ تک دینے کے لیے تیار تھیں' جس کی خاطر تم.....؟'' فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے اذیت کے احساس سے مراد شاہ نے لب بھینچ لیے تھے۔ فضا حیران و ششدر سی' پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

مراد شاہ کے الفاظ نے فضا کو چند لمحوں کے لیے جیسے گنگ سا کر دیا تھا وہ تیزی سے پیچھے ہٹی اور کارپٹ پر ان کے قدموں میں آ بیٹھی پھر ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ ''اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی شاہ جی! وہ بھی ان لوگوں کے بارے میں جو آپ کو ٹوٹ کر چاہتے ہوں۔'' ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے بے حد آہستگی سے کہا۔

مراد شاہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''ہاں شاہ جی! فضا نے صرف اور صرف آپ سے محبت کی ہے۔ غور سے دیکھیں' کیا آپ کو ان آنکھوں میں کسی اور کی شبیہہ نظر آتی ہے؟'' وہ کہہ رہی تھی اور جانے ایسا کیا تھا اس کے لہجے اور اس کی آنکھوں میں کہ ان کی تمام تر بے یقینیوں کو خود بخود یقین آ گیا۔ ساری بے چینی پل میں ختم ہو گئی اور مسرت و سرشاری ایک کیف آگیں احساس بن کر رگ و پے میں گردش کرنے لگی۔ انہوں نے بے حد محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا تھا اور اپنے برابر بٹھا لیا۔

''چلو اب جلدی سے میرا تحفہ دے دو' انتظار مشکل ہو رہا ہے۔''

''چھوڑیں شاہ جی میں کیا اور میرا تحفہ کیا!'' ایک دم ہی اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ستانے لگا۔

''نا یار! یہ ظلم مت کرنا۔ پہلی بار تو مجھے اپنی سالگرہ پر کوئی تحفہ ملنے والا ہے وہ بھی تم.....'' بے اختیار ہی وہ کہہ گئے۔

فضا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر حیران حیران نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔ کیا اس نے صحیح سنا تھا؟ ہاں شاید اس نے یہی سنا تھا کہ مراد شاہ کا پھیکا پڑتا رنگ بھی تو یہی بتا رہا تھا۔ مگر کیوں.....! والدین سے' بہن بھائیوں سے' سارہ شاہ سے کیا کبھی ان کو کوئی تحفہ نہیں ملا تھا؟ مگر اس نے تو سن رکھا تھا کہ امیر لوگ اپنی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ تو پھر..... وہ جانے کب تک یونہی ورطۂ حیرت میں ڈوبی انہیں دیکھتی رہتی اگر یہ محسوس نہ ہوتا کہ مراد شاہ بے دھیانی میں کہہ تو گئے تھے مگر اب جیسے پچھتا رہے ہوں۔

''چلیں پھر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔'' اس نے فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

مراد شاہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''شاہ جی ساری دنیا سے اچھے میرے شاہ جی! یہ لڑکی' بے حد عام سی' بے حد ادنیٰ سی یہ فضا شاہ بن کر خود کو کتنا خاص' کتنا خوش نصیب سمجھنے لگی ہے آپ کو بتا نہیں سکتی۔ یہ آپ سے بے پناہ' بے انتہا محبت کرتی ہے' اتنی جتنی دنیا میں کبھی کسی نے کسی سے نہ کی ہوگی۔'' اس کی بے حد دھیمی' خواب آگیں آواز محبتوں کی برکھا برسا رہی تھی اور وہ اس برکھا میں بھیگتے چلے جا رہے تھے۔

ریگستان سے نخلستان تک کا سفر جیسے پل میں طے ہو گیا تھا۔

کیسا انوکھا تھا یہ تحفہ' دنیا کی ہر دولت اس تحفے کے سامنے ہیچ تھی۔

''شاہ جی! آپ میرے لیے اللہ کا انعام ہیں' اللہ کی محبت کا بے حد خوب صورت روپ' آپ جانتے ہیں میں نے آپ کو پہلی بار کہاں دیکھا تھا؟''

''نہیں.....'' سحر زدہ سی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''میری زندگی کا وہ دن جسے میں تاحیات فراموش نہیں کر سکتی۔ جب میری دادی کی کوئی بات' کوئی جواز سنے بغیر کسی منت اور فریاد پر کان دھرے بغیر مالک مکان ہمارا سامان اٹھا اٹھا کر باہر پھینک رہا تھا میں انتہائی بے بسی کے ساتھ صحن کے ایک کونے میں سکڑی سمٹی کھڑی دھندلی آنکھوں کے ساتھ کبھی اپنے سامان کو گلی میں گرتے دیکھتی تھی اور کبھی روتی اور منتیں کرتی دادی کو' جن کا بوڑھا جسم کانپ رہا تھا اور وہ جانے کیسے اپنے قدموں پر کھڑی تھیں۔ میرا دل رنج و غم سے جیسے پھٹنے کو تھا۔ اس قدر ذلت اور ایسی بے بسی' پہلی بار مجھے اللہ سے شکوہ ہوا تھا اور پلک جھپکنے سے بھی پہلے میرے اللہ نے یہ شکوہ دور کر دیا تھا۔ آپ کسی فرشتے کے مانند وہاں آئے اور دادی کے بندھے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ انہیں اپنے کندھے کے ساتھ لگاتے ہوئے سارا سامان اندر رکھوایا اور چھ ماہ کا کرایہ وزیر دین کو دیتے ہوئے اپنے ڈرائیور کو تاکید کی تھی کہ وہ ہر ماہ کرایہ آپ سے لے کر ہمیں پہنچایا کرے۔ آپ نے مجھ پر ایک نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی مگر میری نگاہ آپ پر سے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ دل و جان آپ پر قربان ہوئے جا رہے تھے۔ آپ چلے گئے لیکن میرے لیے زندگی کا مفہوم بدل گئے تھے۔ آپ کی محبت آپ کی چاہت نے یوں دل میں گھر کیا تھا کہ باقی ہر فکر اور غم سے آزاد کر دیا تھا۔ میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی' نہ آپ کا نام' نہ مقام' میں تو بس یہ جانتی تھی کہ دنیا میں دادی کے بعد اگر کسی کو اپنا سمجھنے لگی تھی تو وہ آپ تھے' کسی کے بارے میں سوچتی تھی تو وہ آپ تھے' کسی سے محبت کرتی تھی تو وہ آپ تھے۔'' وہ کھوئی کھوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

مراد شاہ نے بے یقینی کے ساتھ شدت سے اسے دیکھا۔ ان کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ اک انوکھا سا کیف اور سرشاری انہیں بے خود کیے دے رہی تھی۔ محبت کے بے شمار رنگ ہوتے ہیں اور ہر رنگ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ محبت کے اسرار اور رموز سمجھنے کے لیے اک عمر درکار ہوتی ہے اور ایک عمر کے بعد بھی انسان شاید اسے پوری طرح سمجھ نہیں پاتا۔ کبھی انسان محبت کرتا ہے اور سب کچھ لٹا نے پر تل جاتا ہے۔ جواب میں محبت ملے' پزیرائی ہو نہ ہو' ایسے میں محبوب' محب کے لیے وہ مدار ہوتا ہے جو اگر کھو جائے تو کائنات کی ہر خوشی' ہر دلکشی اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ لیکن کبھی انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ہو' جو اسے چاہے' جو اس سے محبت کرے' جس کے لیے وہ پوری دنیا سے اہم ہو' جس کی تمام خواہشوں.....اور خوشیوں کا وہ محور ہو۔

خواہش اور طلب کے اسی لمحے میں مراد شاہ کو فضا ملی تھی جس کی سنگت اور پیار نے زندگی کے ہر رنگ کو نیا انداز کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

وہ صبح ان کی زندگی کی بے حد سہانی اور یادگار صبح تھی۔

جب ان کی آنکھ کھلی تو وہ جائے نماز پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ آسمانی رنگ کے دوپٹے میں لپٹا اس کا صبیح چہرہ عجیب سی دلکشی لیے ہوئے تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے بے حد پیار سے انہیں نماز کے لیے اٹھایا تھا۔ وہ نماز پڑھتے تو تھے لیکن باقاعدگی سے نہیں' پھر اس وقت نماز کا ٹائم بھی کم تھا اس لیے اگلے دن سے باقاعدگی سے نماز پڑھنے کا ارادہ کر کے اس پر محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ مگر پھر نیند نہیں آئی تھی۔ انہیں بے شمار ایسی صبحیں یاد آئی تھیں جب ان کی شدت سے خواہش ہوتی کہ سارہ ان کے لیے جاگے' انہیں تیاری میں مدد دے.....ان کے ساتھ ناشتا کرے' مگر وہ بے سدھ سوئی رہتی۔ خال خال ہی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ صبح اٹھ جاتی۔ وہ بھی تب جب اس کی کوئی اپنی مصروفیت ہوتی تھی۔ شروع شروع میں انہوں نے ایک دو بار اس سے کہا مگر اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔

''مراد پلیز! مجھے عادت نہیں ہے صبح جلدی اٹھنے کی.....پھر سارا دن طبیعت بوجھل رہتی ہے۔''

اس کے بعد مراد شاہ نے کبھی اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ انہوں نے بے شمار دوسری باتوں کی طرح دل کو سمجھا لیا تھا اور دل کو سمجھانے کے علاوہ کچھ اور ان کے اختیار میں تھا بھی تو نہیں لیکن اب وہ وقت گزر گیا تھا۔ اب انہیں یقین تھا کہ ان کی ہر صبح یونہی رنگ و نور سے بھرپور ہوا کرے گی اور اس کے لیے یقیناً ان پر اپنے مالک کا شکر واجب تھا۔

طمانیت کی گہری سانس لیتے ہوئے وہ بستر سے اٹھ گئے تھے۔

''ناشتا کس وقت کریں گے شاہ جی!''

''جب ہماری بیگم کروائیں گی۔'' انہوں نے بے حد محبت سے اسے دیکھا۔

''ابھی بنا دوں.....؟'' خود پر جمی ان کی محبت پاش نگاہوں پر محجوب ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ناشتا..... چلو آج ناشتا میں بناتا ہوں۔'' انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔ ''لیکن صرف آج پہلے سے بتا دوں' کہیں ایسا نہ ہو میرے ہاتھ کا ذائقہ تمہیں کچھ زیادہ بھا جائے اور.....'' مسکراہٹ دباتے ہوئے انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا اور اس کے ساتھ کچن کی طرف بڑھے پھر ہلکی پھلکی باتوں میں' محبت بھری چھیڑ چھاڑ میں انہوں نے فضا کو سینڈوچ میکر پر سینڈوچ بنانا' جوسر سے جوس نکالنا' چائے دم کرنا سکھا دیا تھا اور اس دوران ایک بار بھی انہیں سارہ شاہ یاد نہیں آئی تھی۔

''شاہ جی! امان ناشتے میں کیا لیتا ہے۔'' ناشتا کرتے ہوئے فضا نے اچانک پوچھا تھا اور تب مراد کو سارہ شاہ یاد آئی تھی۔ انہیں یاد آیا تھا کہ کل اس کی کال پر انہوں نے اسے کچھ دیر بعد کال بیک کرنے کو کہا تھا' اور پھر بھول گئے تھے۔

''کیا بات ہے شاہ جی! آپ کچھ پریشان ہو گئے ہیں؟'' وہ ایک لمحے میں ان کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو بھانپ گئی تھی۔

''آں..... ہاں.....'' وہ چونک کر سیدھے ہوئے تھے اور سنبھل کر نفی میں سر ہلاتے ناشتا کرنے لگے تھے۔ فضا چند لمحے انہیں دیکھتی رہی تھی پھر سر جھکا لیا تھا۔

''دراصل کل سارہ کا فون آیا تھا جو میں نے کچھ دیر بعد کال کرنے کا کہہ کر بند کر دیا تھا۔ وہ لمحے میں صرف تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ دوسری ہر مصروفیت کو ترک کر کے ہر خیال کو جھٹک کر اس لیے میں نے فون بند کر دیا تھا۔ کھولنا یاد رہا نہ سارہ کو فون کرنا یاد آیا۔ اگر اس نے دوبارہ کال کی ہوگی تو سخت ناراض ہو رہی ہوگی۔'' اسے خاموش سا دیکھ کر انہوں نے ساری بات بتا دی تھی۔

''تو ناشتے کے بعد آپ خود انہیں فون کر لیں۔'' اس نے فوراً تجویز پیش کی تھی۔

''ہوں.....'' انہوں نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا اور اپنی پلیٹ میں رکھے سینڈوچ کا ایک ٹکڑا چھری سے کاٹا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

ایسی محبت' ایسی چاہت اس جیسی معمولی سی لڑکی کے لیے..... وہ اللہ کی اس عطا پر کیسے اس کا شکر ادا کرتی' بے اختیار اس کا دل بھر آیا' آنکھیں احساسِ تشکر سے چھلک پڑنے کو تھیں۔ بمشکل اس نے دلی کیفیت پر قابو پایا اور منہ کھول دیا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی نے مراد شاہ کو پریشان کر دیا۔

''فضا..... تم.....!'' ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کہیں' کیا پوچھیں لیکن انہیں جیسے کچھ بھی کہنے کی' کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بنا کہے ہی ان کے دل کی بات جان لیتی تھی۔

''یہ سب اتنا غیر متوقع ہے شاہ جی کہ ..... سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے اپنے اللہ کا شکر ادا کروں.....؟ آپ کی اتنی محبت' یہ چاہت یوں مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا' میں نے کب یہ سوچا تھا شاہ جی! میں کب اس قابل تھی جو..... جو.....'' بمشکل رک رک کر کہتے ہوئے اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ مراد شاہ چند ثانیے حیران حیران سے اسے دیکھتے رہے تھے پھر آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تسلی دینے لگے۔ جلد ہی وہ سنبھل گئی اور سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔

''دیکھیں تو کتنی بری بیوی ہوں آپ کو ناشتا تک آرام سے نہیں کرنے دیا؟''

''بیوی تو تم بہت اچھی ہو..... ناشتا بھی میں نے آرام سے کر لیا ہے لیکن.....''

''لیکن.....'' ان کی ادھوری بات پر وہ جلدی سے سیدھی ہوتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی۔

''یہ تمہارے آنسو جو پل میں نکلنے کو بیتاب ہو جاتے ہیں یہ بہت پریشان کر دیتے ہیں۔'' مراد شاہ نے کچھ ایسی بے بسی کے انداز میں کہا کہ وہ بے اختیار ہنسنے لگی اور مراد شاہ

بارش میں دھوپ کے اس دلکش منظر کو حیرانی بھری دلچسپی سے دیکھنے لگے تھے۔

''یہ تو خوشی اور شکر کے آنسو ہیں شاہ جی! دادی کہا کرتی تھیں فضا! صبح اٹھ کر اللہ کا شکر ادا کیا کرو جس نے سکھ کی نیند سلایا اور خیر و عافیت سے رات گزاری۔ ان کی یہ بات ایسی میرے دل میں اُتری کہ پھر کوئی صبح ایسی نہیں گزری جب میں نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا ہو۔ دادی کے کہنے کے مطابق جب بھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا' جب بھی زندگی میں کوئی اچھا لمحہ آیا' اللہ کا شکر ادا کیا' مگر جیسے ایک عادت کی طرح..... دل کی ایسی حالت تو کبھی بھی نہیں ہوئی شاید اس لیے کہ ایسی خوشی بھی تو کبھی نہیں ملی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے شاہ جی! جیسے جنت دنیا میں ہی مل گئی ہو۔'' کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہتی وہ مراد شاہ کے دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی تھی۔

''چلو فضا! آج تم مجھے اپنی دادی کے بارے میں بتاؤ..... اپنے والدین کے بارے میں' اپنے بچپن کے بارے میں' اسپتال سے نکل کر تم کہاں گئیں؟ کس کے پاس رہیں کہ دادی تو حیات نہیں تھیں اور نہ ہی کوئی قریبی عزیز تھا۔''

''سب باتیں بے حد عام سی ہیں شاہ جی! آپ سن کر بور ہی ہوں گے۔ کیونکہ ان باتوں میں نہ کوئی حسن ہے نہ دلکشی' نہ کہیں مسکراہٹ' نہ ہنسی۔'' دھیرے سے کہتے ہوئے وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

مراد شاہ نے بے حد محبت اور اپنائیت کے ساتھ اس سے کہا۔

''فضا جیون ساتھی کا مطلب ہوتا ہے زندگی کے ہر لمحے' ہر خوشی' ہر دکھ' ہر پریشانی اور ہر مسئلے میں ساتھ دینے والا حصے دار' چلو شروع ہو جاؤ اپنے بچپن سے۔''

وہ خاموشی سے چند لمحے انہیں دیکھتی رہی تھی۔

''فضا..... میری پیاری بیوی!'' ان کے پیار بھرے چمکارتے انداز پر وہ بے اختیار مسکرائی' پھر کھوئے کھوئے سے انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے جیسے کچھ سوچنے لگی تھی۔ وہ منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''بھلا کیا بتاؤں' اور کہاں سے؟'' زیر لب کہتے ہوئے اس نے مراد شاہ کی طرف دیکھا تھا اور انہیں ہمہ تن گوش بیٹھے دیکھ کر چند لمحوں کے توقف کے بعد دھیمی سی آواز میں بتانا شروع کیا۔

''ابا جان میری پیدائش سے قبل ہی ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے اور اماں میری پیدائش پر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ یوں میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے اردگرد صرف دادی کو دیکھا۔ دادی میری ماں کی سگی خالہ تھی اور نانی کی وفات پر انہوں نے اماں کو گود لیا تھا۔ اماں اکلوتی تو نہیں تھیں' ان کے دو بھائی بھی تھے مگر وہ اپنے مسائل میں یوں پھنسے ہوئے تھے کہ ان کا ہونا نہ ہونا میرے لیے برابر ہی تھا۔ بچپن سے جوانی تک وہ دو یا تین بار سے زیادہ مجھ سے ملنے نہیں آئے اور ابا تو تھے ہی اکلوتی اولاد' ایسے میں دادی ہی میرے لیے سب کچھ تھیں۔ ماں باپ' بہن بھائی بھی اور عزیز رشتے دار بھی۔ اپنے محدود وسائل کے اندر انہوں نے میری بہترین پرورش کی۔ میں نے پرائمری اسکول کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ مجھے یاد ہے دادی اس دن بے حد خوش تھیں۔ انہوں نے میٹھے چاول بنا کر پورے محلے میں بانٹے تھے۔ مجھے بار بار پیار کرتے ہوئے وہ مجھے بہت سا پڑھانے کی خواہش کا اظہار کر رہی تھیں' پھر وہ مجھے بازار لے کر گئی تھیں اور بے حد پیارا سا سوٹ اور نئے جوتے دلوائے تھے۔ وہ دن میری زندگی کا ایک خوب صورت دن تھا' لیکن پھر اس کی خوب صورتی اور میری خوشی کو جانے کس کی نظر لگ گئی تھی' دادی واپسی پر گلی کے نکڑ پر پھیلے کیچڑ پر سے پھسل گئی تھیں اور ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ محلے والے انہیں اسپتال لے گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے ان کی ٹانگ پر پلستر چڑھا دیا تھا۔ اور وہ دن جو خوشی اور مسرت سے بھرپور تھا اس کی رات بے حد تکلیف دہ اور اذیت ناک تھی۔ دادی کے بے حد درد تھا اور وہ بار بار کراہ رہی تھیں اور ان کی تکلیف کا خیال مجھے بھی بے چین کیے ہوئے تھا۔ وہ پہلی رات تھی کہ جب میں بے خبری اور بے فکری کی نیند کے مزے لوٹنے کے بجائے جاگ رہی تھی۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر پیار کرتے ہوئے' کبھی ان کا سر دباتے ہوئے' درد کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بار بار مجھے سونے کا کہہ رہی تھیں مگر ان کی تکلیف کا احساس مجھے سونے نہیں دے رہا تھا' لیکن آخر تھک کر آدھی رات گزر جانے کے بعد جانے کس

وقت میری آنکھیں بند ہوگئی تھیں اور اپنے ہوش میں وہ پہلی صبح تھی جب میری آنکھ کھلی تو دادی بستر پر دراز تھیں ورنہ ہر صبح جب میں جاگا کرتی تھی تو وہ قرآن پاک پڑھ رہی ہوتی تھیں۔ میں نماز سے فارغ ہوتی تو وہ مجھے سپارہ پڑھاتیں اور پھر اشراق کی نماز پڑھنے کے بعد ناشتا بناتیں۔ اس صبح وہ لیٹی رہی تھیں اور میں نے چائے بنائی تھی اور چائے کے ساتھ پاپے دادی کو بھی کھلائے تھے اور خود بھی کھائے تھے۔ ناشتا کرنے کے بعد میں دادی کے کہنے پر تیار ہو کر اسکول چلی گئی تھی لیکن دل ہی دل میں دادی کے لیے فکرمند بھی تھی۔ کلاس میں بھی معمول کی طرح پڑھائی پر توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ میرا دھیان رہ رہ کر دادی کی طرف چلا جاتا تھا کہ وہ اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔ پیاس لگی تو پانی کیسے پئیں گی اور باتھ روم میں کیسے جائیں گی۔ اور ایک دم مجھے دادی کی تکلیف اور ان کی بے بسی پر رونا آنے لگا تھا اور تبھی مس فرحت کلاس سے باہر نکل گئی تھیں اور میں ڈیسک پر سر رکھ کر رونے لگی تھی۔

''کیا ہوا فضا! آپ کیوں رو رہی ہیں؟'' کندھے پر ہاتھ کے نرم سے دباؤ کے ساتھ میڈم فریحہ کی شفیق آواز پر میں نے بوکھلا کر سر اٹھایا تھا۔

''کک..... کچھ نہیں میڈم.....!'' میں نے بوکھلا کر کہا تھا۔

''اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے' شاباش جلدی سے بتائیں کیوں رو رہی ہیں آپ؟'' انہوں نے میرے سر کو ہلکے سے تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا اور جانے کیوں ایکدم میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے اتنا زیادہ رونا کیوں آنے لگا تھا۔ میڈم فریحہ نے کچھ دیر مجھے رونے دیا تھا بس نرمی سے میرا سر تھپکتی رہی تھیں۔

پھر چھٹی کے وقت وہ دادی کی عیادت کے لیے میرے ساتھ گھر آئی تھیں اور میں ان کی آمد پر کبھی حیران اور کبھی خوش ہوتی انہیں دیکھتی رہی تھی۔ انہوں نے دادی کے نہ نہ کرنے کے باوجود انہیں زبردستی پانچ سو روپے دیئے تھے کہ وہ کوئی دوا یا پھل وغیرہ منگوالیں اور دادی نے پھل یا دوا کے بجائے اسی دن رضیہ خالہ کے بیٹے سے راشن منگوالیا تھا۔

''دادی آپ نے اپنے لیے پھل کیوں نہیں منگوائے۔'' میں نے پوچھا تھا۔

''یہ چیزیں زیادہ ضروری تھیں بچے' ابھی پتا نہیں کتنے دن لگیں مجھے ٹھیک ہونے میں جبکہ میں نے تو اپنی جمع پونجی تقریباً ختم کر دی تھی اور اب دل میں فکرمند تھی کہ گھر کیسے چلے گا۔ بے شک اللہ بہت رحیم ہے اور بہترین رازق بھی' کیسے اپنے پیارے لوگوں کو مجبوروں کا وسیلہ بناتا ہے۔'' انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے طمانیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ لیکن میرا ذہن تو کہیں اور ہی اٹکا ہوا تھا۔

''دادی اگر آپ کے پاس پیسے بالکل ختم ہو گئے ہیں تو اب ہم کیا کریں گے یہ چیزیں تو تھوڑے ہی دن چلیں گی نا! اور آپ کی ٹانگ پر تو ابھی کافی دن پلستر چڑھا رہے گا۔ دوائیں بھی لانی ہوں گی۔'' ان کے خاموش ہوتے ہی میں نے فوراً کہا تھا۔

انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا اور پھر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''فضا! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے' اللہ پاک اس کی ہر ضرورت کو پورا فرماتے ہیں اور ایسی جگہ سے اس کو روزی عطا فرماتے ہیں جہاں سے اس کو گمان تک نہیں ہوتا اور وہ تو ایسا رازق ہے بیٹا کہ پتھر کے اندر کیڑے کو رزق پہنچاتا ہے۔ پھر بھلا وہ انسان جسے اس نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اسے کیسے بھول جائے گا؟'' انہوں نے کچھ ایسے یقین' اس قدر جذب کے عالم میں کہا تھا کہ میں انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

دادی کی بیماری کے دوران خالہ بتول نے ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ وہی دادی کا خیال رکھتیں' ہانڈی جیسے تیسے میں خود بنا لیتی اور روٹیاں وہ بنا دیتی تھیں۔ لیکن ان کے میاں چاچا صابر کی بار بار آمد مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ ایک تو ان کا دیکھنے کا انداز بے حد عجیب تھا دوسرا حلیہ گندا سا ہوتا تھا' شاید اس وجہ سے' بہرحال وجہ جو بھی تھی لیکن وہ مجھے قطعاً اچھے نہیں لگتے تھے۔ اور یہی بات میں نے ایک دن دادی سے کہہ دی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی تھیں پھر انہوں نے وجہ پوچھی تھی۔

''یونہی دادی' کچھ عجیب سے ہیں۔ اپنی سرخ اور ڈراؤنی آنکھوں سے گھور گھور کر دیکھتے رہتے ہیں۔'' میں نے کہا تھا اور دادی یکدم بے حد سنجیدہ ہو گئی تھیں۔

"تم دوبارہ صابر کی موجودگی میں بتول کی طرف مت جانا فضا!ایک طویل خاموشی کے بعد انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا اور میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیران نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی تھی لیکن پھر جلد ہی میری سمجھ میں سب کچھ آنے لگا تھا۔دادی کی بیماری نے جیسے ایک دم مجھے بہت بڑا کر دیا تھا۔میں جو ہمیشہ دادی کے ساتھ ہی اسکول جایا کرتی تھی اور سارا راستہ ان کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی اب اکیلی اسکول جا رہی تھی اور راستے پر اکثر اوقات مجھے صابر چاچا کی طرح کی ناپسندیدہ اور چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا خاص طور پر گلی کی نکڑ پر پان سگریٹ کے کھوکھے پر بیٹھے ہوئے چند اوباش قسم کے لڑکوں کی فقرہ بازی میں ایک دم ہی کمسن بچی سے جیسے سمجھدار عورت بن گئی تھی۔گھر سے نکل کر میں ادھر ادھر دیکھتی اور جونہی محلے کے اور بچے جاتے نظر آتے تو تیزی کے ساتھ ان کے برابر جا پہنچتی۔اسی طرح واپسی پر چھٹی کے وقت محلے کی دو بڑی لڑکیوں کے ہم قدم ہو جاتی جو نویں دسویں کی طالبائیں تھیں۔لیکن جانے انہیں میرے ساتھ چلنے میں کیا مسئلہ تھا کہ تیسرے دن انہوں نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔

"کیا تکلیف ہے تمہیں.....؟"

"جی" میں جو اس ڈانٹ کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی ایک دم روہانسی ہو گئی تھی۔

"جی کی لگتی ادھر ادھر جگہ نہیں ہے جو ہر روز ہمارے ساتھ چپک جاتی ہو" میٹرک میں پڑھنے والی سعدیہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے مجھے گھورا تھا۔

"اور یوں بلی کی سی چال سے قریب آتی ہے کہ پتا بھی نہیں چلتا" ناظمہ نے بھی لقمہ دیا تھا۔

"اب دیدے پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو چلتی پھرتی نظر آؤ" سعدیہ نے کہا تھا۔ایکدم میرے آنسو مچل کر گالوں پر لڑھک آئے تھے۔

"بب.....باجی مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے..... پہلے تو دادی کے ساتھ آیا کرتی تھی۔" دادی کے ذکر پر مجھے رونا آ گیا تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہیں سڑک پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور ان دونوں کو پتا نہیں میرے رونے پر ترس آیا تھا یا میرے ڈرنے پر بہر حال وہ جیسے ایک دم پسیج سی گئی تھیں۔مجھے چپ کرواتے ہوئے انہوں نے دونوں ٹائم مجھے ساتھ چلنے کی دعوت دے دی تھی اور میں خوش ہو گئی تھی مگر یہ خوشی زیادہ دیر برقرار نہیں رہی تھی اور ایک عجیب سی بے چینی اور بے سکونی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ان دونوں کی ذو معنی باتیں کبھی میری سمجھ میں آتیں کبھی سر پر سے گزر جاتیں۔سارا راستہ ادھر ادھر دیکھتے رہنا اور اونچی آواز میں کھلکھلا کر ہنسنا مجھے سخت برا لگتا۔سارا راستہ ننگے سر چلتے آنا اور گھر کے قریب پہنچ کر سر اچھی طرح ڈھانپ لینا حیران کرتا۔میرا دل چاہتا میں انہیں وہ سب باتیں بتاؤں جو دادی وقتاً فوقتاً مجھے بتایا کرتی تھیں جن میں سر ڈھانپ کر رکھنے اور باہر نکل کر اونچی آواز میں نہ بولنے اور نہ ہنسنے کی تاکید بھی شامل تھی لیکن جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان باتوں پر ناراض ہو جائیں گی حالانکہ مجھے تو دادی کی باتیں بے حد اچھی لگتی تھیں۔میں دادی کی ایک ایک بات غور سے سنتی تھی اور اس پر پوری طرح عمل کرنے کی کوشش بھی کرتی تھی اور یہ انہی دنوں کی بات تھی جب چاچا صابر دادی کی طبیعت پوچھنے کے لیے گھر آئے تھے۔

میں دروازے کے قریب جھاڑو دے رہی تھی۔انہوں نے جاتے جاتے پھر مجھے ان ہی نظروں سے گھورا تھا اور اس بار دادی نے بھی دیکھ لیا۔انہوں نے اس وقت تو خاموشی سے رخ موڑ لیا تھا لیکن اگلے دن صابر چاچا کو بلا کر بڑے طریقے سے بات کی تھی لیکن دادی کے تحمل بھرے انداز کے باوجود ان کی تیوریوں کے بل دیکھنے والے تھے۔مگر دادی نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔

"بے شک تم میرے بیٹے جیسے ہو صابر اور تم میاں بیوی نے ہمیشہ میرا بہت خیال بھی رکھا ہے لیکن فضا بن ماں باپ کی بچی ہے اور جہاں خوف خدا رکھنے والے یتیم بچیوں کو اپنی بچیوں کی طرح سمجھتے ہیں وہیں غلط سلط باتیں بنانے اور پھیلانے والے بھی کم نہیں۔فضا اب بڑی ہو رہی ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ تم سب کو سمجھا دوں کہ تمہاری بیویاں سو دفعہ میرے گھر آئیں مگر تم لوگ اب یہاں نہ آیا کرو" دادی نے بے حد ٹھنڈے میٹھے لہجے میں کہا تھا مگر صابر چاچا اچھل کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جانے کیا کیا بڑبڑاتے دھپ دھپ کرتے دروازے سے نکل گئے تھے۔

اور پھر جیسے زندگی کا ایک عجیب اور تکلیف دہ دور شروع ہوا تھا۔صابر چاچا نے بتول خالہ کو بھی آنے سے روک دیا تھا جس کی وجہ سے مجھے دادی کی دیکھ بھال کے لیے

اسکول چھوڑنا پڑا جس کا مجھے ازحد رنج تھا۔ دادی کو ضروری حاجات کے لیے اٹھانا لٹانا ایسا مشکل مرحلہ تھا کہ میرا پورا جسم ہل کر رہ جاتا۔ سارا دن گھر کے چھوٹے موٹے کام ' کھانا پکانا' میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگتا لیکن ایک آس میری ہمت بندھاتی کہ انشاءاللہ جلد ہی دادی ٹھیک ہو جائیں گی اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ دادی کی ٹانگ ٹھیک نہ ہو سکی۔ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے ان کا زخم خراب ہو گیا۔ وہ تکلیف کی وجہ سے اب مجھے تسلی دلاسا بھی نہ دے پاتیں اور ان کی جو باتیں میری تھکن بھلاتی تھیں میری ہمت بندھاتی تھیں' کم ہوئیں تو میرے حوصلے بھی پست ہونے لگے تھے۔ اوپر سے سارا راشن ختم ہونے والا تھا۔ اس کے بعد کیا ہونے والا تھا۔ سب چیزیں کیسے اور کہاں سے آنی تھیں' کچھ پتا نہ تھا۔ ایسی ہی بے شمار فکروں میں گھرتے ہوئے میں نے ایک دن خوب پریشان ہو کر دادی سے کہا تھا۔

''آٹا' گھی' نمک' مرچ سب کچھ ختم ہونے والا ہے..... یہ چیزیں ختم ہو جائیں گی تو پھر کیا کریں گے دادی!''

دادی کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی تھیں پھر انہوں نے مجھے قریب بلایا تھا۔

''فارغ ہو گئی ہو یا ابھی کچھ کرنا ہے؟ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے انہوں نے بڑی محبت اور شفقت سے پوچھا تھا۔

''کپڑے دھونے ہیں مگر سوچ رہی ہوں کہ صابن کم ہے تو اگر کل دھوؤں گی تو آپ کے یہ والے کپڑے بھی بچنے والے جھاگ میں مل لوں گی۔'' میں نے کہا تھا۔ میری اس بات پر مجھے یوں لگا جیسے دادی کی آنکھوں میں نمی سی آئی تھی مگر فوراً ہی انہوں نے پلکیں جھپک کر اسے اندر ہی اتار لیا تھا۔

''بھئی میری فضا تو بڑی عقلمند ہو گئی ہے اور بہت ہنرمند بھی' میرا خیال ہے کہ کپڑے کل دھو لیا۔ اب آ جاؤ کچھ دیر دادی پوتی باتیں کرتے ہیں۔ میں تو ترس گئی ہوں تجھ سے بات کرنے کو۔'' اچانک ہی ان کے لبوں سے نکلا تھا اور میں حیران حیران سی ان کا منہ تکنے لگی تھی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ اپنی تکلیف کی وجہ سے دادی کا دل نہیں چاہتا تھا بات کرنے کو مگر وہ تو.....

''میری بچی سارا دن کام کر کر کے ہلکان ہو جاتی ہے' پھر مجھ بیمار بڑھیا کی خدمت الگ..... باتوں کا ہوش ہی کہاں رہتا ہے ایسے میں۔'' وہ شرمندہ شرمندہ سی کہہ رہی تھیں۔

میں نے آگے بڑھ کر ان کے جھریوں بھرے چہرے پر بوسہ دیا تھا اور ان کا ہاتھ پیار سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

''دادی میں تو سمجھتی تھی کہ تکلیف کی وجہ سے آپ کا باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا' ورنہ آپ کی باتیں تو میری ساری تھکن دور کر دیا کرتی تھیں۔'' میں نے ان کے ہاتھ کو اپنے گال کے ساتھ لگاتے ہوئے پوری سچائی سے کہا تھا اور پھر اپنی چارپائی ان کی چارپائی کے برابر گھسیٹ کر لیٹ گئی تھی۔ ''چلیں آج خوب گپیں لگاتے ہیں۔'

''ہوں..... پہلے تو تم یہ بتاؤ ابھی تم کیا کہہ رہی تھیں کہ سارا راشن ختم ہونے والا ہے؟''

''ہاں..... کھینچ تان کر دو یا تین دن چل جائے گا۔'' میں پھر سے پریشان ہو گئی تھی۔

''فضا! بچے پہلے بھی میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ رزق کے معاملے میں پریشان نہیں ہوتے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے تو یہ بالکل درست ہے۔''

اس دن رات کو بے حد تیز بارش ہوئی تھی۔ صحن کے ایک کونے میں بنی ہوئی دادی کی چھوٹی سی دکان ٹپا ٹپ ٹپکنے لگی تھی۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر کمرے میں رکھتے ہوئے میں بری طرح بھیگ گئی تھی۔ کچھ تو صبح سے ہی میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور رہی سہی کسر بھیگنے نے پوری کر دی تھی۔ صبح میں تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔

میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گئی اور دوبارہ لیٹ گئی مجھے اپنے اور دادی کے لیے ناشتا بنانا تھا لیکن مجھے خود بھی معلوم تھا کہ گھر میں سارا سامان ختم ہو گیا ہے اور یہ بات دادی کو بھی معلوم تھی۔

کافی دیر میں خاموش لیٹی رہی تھی پھر آہستگی سے دادی کی جانب دیکھا تھا وہ کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی چھت کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''کیا سوچ رہی ہیں دادی!'' میں نے ان کی طرف رخ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں بچے بس سوچ رہی تھی کیا محلے کے بچوں میں سے کوئی بچہ ایسا ہوسکتا ہے جو تھوڑی بہت اجرت پر کچھ دن دکان کھول لے۔ کم از کم سامان بھی ختم ہو اور کچھ راشن پانی کا انتظام بھی ہو جائے۔''

''ہاں دادی! ایسا ہوسکتا ہے۔'' میں نے پر جوش لہجے میں کہا تھا اور وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی تھیں پھر نفی میں سر ہلایا تھا اور میں حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ ''دادی! یہ کام میں بھی تو کرسکتی ہوں۔'' میں نے کہا تھا اور دادی نے اپنا بوڑھا ہاتھ ایک دم میرے لبوں پر رکھ دیا تھا۔

''دوبارہ ایسی بات مت کرنا فضا! یہ بچیوں کے کرنے کا کام نہیں ہے اللہ کوئی اور انتظام کرے گا۔'' دادی نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا تھا اور میں حیران حیران سی ان کے پرسکون چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

پھر پتا نہیں کس وقت لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ جانے کیا وقت تھا جب کسی کھٹکے پر میری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے جلدی سے دادی کی طرف دیکھا تھا وہ بھی میری طرف متوجہ تھیں۔

''پتا نہیں کتنی دیر سوئی رہی میں..... دادی آپ کو تو بھوک لگ رہی ہوگی۔'' میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھ سے اٹھا نہیں گیا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور جسم میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ دل تھا کہ نیچے ہی نیچے بیٹھا جا رہا تھا۔ بھوک کے مارے جب میرا یہ حال تھا تو دادی بے چاری جو بوڑھی بھی تھیں اور بیمار بھی اس خیال کے آتے ہی میں کوشش کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور بمشکل اپنے بے جان جسم کو گھسیٹتے باہر کی طرف بڑھی تھی۔ مگر جانے کیا ہوا تھا کہ ایک دم میرا سر چکرایا تھا اور خود کو سنبھالنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود میں اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔ گرتے گرتے دروازے کے ساتھ رکھی ہوئی اینٹ کا کونا میرے ماتھے میں لگا تھا اور ایک دم میری چیخیں نکل گئی تھیں۔ اب صورت حال یہ تھی کہ میں باہر بے بسی سے رو رہی تھی اور دادی اندر کوئی ہمیں اٹھانے والا یا دو گھونٹ پانی پلانے والا بھی نہیں تھا۔ مارے بے بسی اور بے چارگی کے مجھے اور شدت سے رونا آنے لگا تھا۔ تبھی دروازہ کھلا تھا اور کوئی اندر آ گیا تھا۔

میں نے ذرا سا گردن موڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تھی اور میڈم فریحہ کو دیکھ کر میں حیران ہوئی تھی وہ بھی اس صورت حال کو دیکھ کر پریشان سی ہوگئی تھیں۔ پھر انہوں نے جھک کر میرے پاس بیٹھتے ہوئے میرے دوپٹے کے پلو سے ماتھے سے بہتا خون صاف کیا تھا اور پیار سے سہارا دے کر اندر لائی تھیں۔ دادی کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دیکھ کر مجھے پھر سے رونا آنے لگا تھا۔ دادی کی حالت کے پیش نظر میڈم فریحہ نے فوراً فون کر کے ایمبولینس منگوائی تھی اور مجھے اور دادی کو اسپتال لے آئی تھیں۔ میرے ماتھے پر پٹی کروائی تھی اور دادی کو ڈاکٹر نے اسپتال میں داخل کرلیا تھا۔ میڈم فریحہ تو جیسے ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئی تھیں۔

دادی بہترین خوراک اور دیکھ بھال کی وجہ سے جلد ہی صحت یاب ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹرز نے ان کا پلستر کھول دیا تھا۔

ان کی ہڈی جڑ گئی تھی لیکن بڑھاپا تھا یا کمزوری کہ تھوڑا سا چل کر وہ تھک جاتی تھیں اور ان کے درد شروع ہو جاتا تھا۔ جس دن ہم گھر آئے میں بے حد خوش تھی۔ دادی ہر ہر سانس کے ساتھ میڈم فریحہ کو دعائیں دے رہی تھیں کہ جن کی مدد کی وجہ سے وہ دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تھیں۔

میڈم فریحہ نے اپنے ڈرائیور سے ہمارے یہاں اتنا راشن ڈلوایا تھا جو پورے ایک ماہ آسانی سے گزر بسر کے لیے کافی تھا اور اس شام لگتا تھا جانے کتنے عرصے کے بعد میں اور دادی مل کر شام کی نماز ادا کر رہے تھے۔ نماز کے بعد میں وہیں جائے نماز پر دادی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔

''دادی! آج میں بہت خوش ہوں کتنے دنوں کے بعد ہم دونوں نے مل کر نماز پڑھی ہے اور بے حد سکون محسوس ہو رہا ہے۔ ورنہ میں اکیلی نماز پڑھتی تھی تو دل آپ کی طرف لگا رہتا تھا۔''

''دادی میں صبح سے اسکول جاؤں گی نا!'' میں اسکول جانے کے خیال سے بے حد خوش تھی لیکن دادی کے چہرے پر پھیلے تفکر کے سائے مجھے اپنی اس خوشی کو نگلتے محسوس ہوئے تھے۔ میں ایک دم بے حد پریشان ہوگئی تھی۔ ''دادی کیا بات ہے آپ پریشان کیوں ہوگئی ہیں.....؟'' میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بیتابی سے پوچھا تھا۔

''فضا بچے! ابھی میرے لیے تمہیں اسکول چھوڑنا بے حد مشکل ہے اور اکیلے تمہیں بھیجنا مجھے مناسب نہیں لگ رہا۔'' انہوں نے دھیمی سی آواز میں کہا تھا اور میرا سارا جوش اور خوشی ماند پڑ گئی تھی۔

''دادی! میں سعدیہ اور ناظمہ کے ساتھ چلی جایا کروں گی۔'' میں نے بڑی آس سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ دادی کچھ دیر خاموشی کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی تھیں پھر انہوں نے مجھے اجازت دے دی تھی۔ مگر صابر چاچا اور محلے کے دو تین اوباش لڑکوں نے سعدیہ اور ناظمہ کی گلی سے آگے ذرا سا فاصلہ اکیلے طے کرنا میرے لیے دوبھر کر دیا تھا۔ تیسرے دن میں نے مجبور ہو کر دادی سے کہا تھا کہ وہ دوپہر کو چھٹی کے وقت گھر سے باہر گلی کے نکڑ تک آجایا کریں۔ دادی کے پوچھنے پر میں نے جھجکتے ہوئے ساری بات بتا دی تھی اور پھر پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ آخر میں' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''فضا! میرے بچے! میں اسی وجہ سے تمہیں اسکول بھیجنا نہیں چاہ رہی تھی۔ میں نے صابر کی فطرت کا اندازہ کر لیا تھا اور پھر جس لڑکی کے سر پر کوئی مضبوط سائبان نہ ہو اسے تو ہر کوئی راہ میں پڑا ہوا مال سمجھ لیتا ہے اور میں ایک بوڑھی اور کمزور عورت ہوں بچے! چلو آگے سے تمہیں لینے آ بھی جاؤں تو پھر کیا ہوگا' بہتر یہی ہے کہ تم ان گندی اور مکروہ نگاہوں سے دور رہو۔ تمہارا شوق دیکھتے ہوئے میرا بھی دل چاہتا تھا کہ تم زیادہ تعلیم حاصل کرو مگر حالات اس کے حق میں نہیں ہیں میرے بچے!''

میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے دادی نے گمبھیر لہجے میں کہا اور میں نے روتے دل کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ دادی کی ہر بات چپ چاپ مان لینے کی تو میری شروع سے عادت تھی۔ اسکول چھوڑنے کا مجھے بے حد قلق تھا۔ میرے اندر جیسے کچھ ٹوٹ کر رہ گیا تھا لیکن دادی کی پریشانی کے خیال سے میں بظاہر خود کو نارمل ظاہر کرتی گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ اگلے دن سے دادی نے دکان کھولنا شروع کر دی تھی لیکن پچھلے دنوں محلے کے کونے پر بننے والی پرچون کی اچھی خاصی بڑی دکان کی وجہ سے دادی کے پاس بہت کم گاہک آتے تھے کیونکہ ایک تو دادی کے پاس روزمرہ استعمال کی بس چھوٹی موٹی چیزیں ہی رکھی ہوئی تھیں' دوسرا اتنا عرصہ دکان بند رہنے کی وجہ سے لوگ نئی دکان پر جانے کے عادی ہو گئے تھے۔ اب بس بچے ہی تھے جو گولیاں' ٹافیاں اور ربر پنسل وغیرہ لینے آتے تھے۔ حالانکہ پہلے دکان سے اتنی آمدنی آرام سے ہو جایا کرتی تھی کہ گھر کا کرایہ دینے کے بعد ہماری گزر بسر بھی آسانی سے ہو جاتی تھی۔ مگر اب ایسا ممکن ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں روز چپکے سے کپڑے کی اس تھیلی کو دیکھتی تھی جس میں دادی کرایہ جمع کرنے کی نیت سے ہر روز کچھ پیسے رکھا کرتی تھیں اور اب خالی تھیلی میرا منہ چڑا رہی ہوتی تھی۔

وقت تھا کہ جیسے اسے پر لگ گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی چند دن قبل تو پانچ تاریخ تھی جب دادی نے مالک مکان سے کہا تھا کہ اگلے ماہ اکٹھا کرایہ دے دیں گے اور پورا ماہ گزر بھی چلا تھا' تین دن بعد پانچ تاریخ تھی اور ہمارے پاس ایک پیسہ نہیں تھا۔

اس دن دادی مجھے دروازہ اندر سے بند کرنے کی تاکید کرتی ہوئی صبح ہی صبح گھر سے نکل گئی تھیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ محلے ہی میں ہیں اور ابھی تھوڑی دیر تک لوٹ آئیں گی۔ میں پریشان سے انداز میں جھاڑو لگا رہی تھی جب باہر گلی سے لڑکوں کے بیہودہ سے انداز میں گانے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

میرا دل ایک دم جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ابھی وہ دیوار پھلانگ کر اندر آ جائیں گے۔ بے تحاشا دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ میں نے جلدی جلدی کوڑا وہیں اکٹھا کر کے شاپر میں ڈالا تھا اور اندر کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ لیکن جانے کیا وجہ تھی کہ اندر سے دروازے کو تالا ڈالنے کے باوجود میرے خوف میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ دل ویسے ہی تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر ابھی میں خود پر قابو پانے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ ایک دم دھپ کی آواز کے ساتھ کسی کے صحن میں کودنے کی آواز آئی تھی۔ میں نے چیخنا چاہا تھا لیکن میری آواز جیسے حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی تھی۔ دبے قدموں کی دروازے تک آتی چاپ نے میری جان پر بنا دی تھی۔ دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی اچھل کر باہر نکل آئے گا۔ وجود تیز طوفان کی زد میں آئی شاخ کی مانند کانپ رہا تھا۔ پھر کسی نے آہستگی سے دروازے کو ہلایا تھا اور عین اسی لمحے باہر کا دروازہ بجنے کی آواز آئی تھی۔

''لگتا ہے وہ سالی بڑھیا لوٹ آئی ہے۔'' تیز بڑبڑاہٹ اندر تک صاف سنائی دی تھی۔

''اب جلدی سوچ کیا کرنا ہے''..... اندر سے چھوکری تو نکل کر دروازہ کھولنے سے رہی اور بڑھیا باہر شور مچا دے گی کہ دروازہ کیوں نہیں کھل رہا۔'' جھنجلائی ہوئی یہ آواز میں نے صاف پہچان لی تھی مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ صابر چاچا اس حد تک بھی گر سکتا ہے۔

دادی اب دروازہ بجانے کے ساتھ ساتھ آوازیں بھی دے رہی تھیں۔

''اس سے پہلے کہ بڑھیا کی آوازوں پر اور لوگ بھی گھروں سے نکل آئیں' دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر دروازہ کھولو اور بڑھیا کے اندر آتے ہی بھاگ نکلو۔'' صابر چاچا نے تیزی سے کہا تھا۔ میں ہمت کر کے اٹھی تھی اور کانپتی ٹانگوں کو بمشکل گھسیٹتی دروازے تک آئی تھی۔ تبھی باہر والا دروازہ کھلا تھا اور دادی کی چیخ کی آواز نے میرا دل دہلا دیا تھا۔ لرزتے ہاتھوں کے ساتھ میں نے جلدی سے تالا کھولا تھا اور تیزی سے باہر نکلی تھی۔

باہر کا منظر دیکھتے ہی میرا دل شق ہونے لگا تھا۔ دادی زمین پر پہلو کے بل گری ہوئی تھیں۔ منہ سے نکلتی کراہوں کو روکنے کی کوشش میں ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنسو زاروقطار ان کی بوڑھی آنکھوں سے بہتے جھریوں بھرے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ میں تڑپ کر آگے بڑھی تھی اور انہیں اٹھا کر بٹھاتے ہوئے بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے ان کے آنسو کچھ اور تیزی سے بہنے لگے تھے۔ کانپتے لبوں سے انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر کہہ نہیں پائی تھیں۔ مجھے خود پر ضبط نہیں رہا تھا اور میں ان کے سینے سے جا لگی تھی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی لیکن اگلے ہی لمحے مارے حیرانی کے میرے آنسو جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے انہوں نے اپنا کانپتا ہاتھ میرے لبوں پر رکھ دیا تھا۔

''چپ.....'' سرد لہجے میں کی گئی ان کی سرگوشی پر میں ششدر سی انہیں دیکھنے لگی تھی۔ میرے ہاتھ میں تھما تالا چھوٹ کر میرے پاؤں پر جا گرا تھا لیکن مجھے تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا۔ میں تو دادی کے آنسوؤں بھرے چہرے کو دیکھنے میں محو تھی کہ جس پر اب اطمینان پھیل رہا تھا اور نگاہیں تالے پر جمی ہوئی تھیں۔ ''چلو اندر چلیں.....'' کہتے ہوئے انہوں نے زمین پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ ان کی برداشت اور صبر نے مجھے ہمیشہ کی طرح بے حد متاثر کیا تھا میں نے سہارا دیتے ہوئے انہیں اٹھایا تھا اور آہستگی سے چلاتی ہوئی اندر ان کے بستر پر لے آئی تھی۔ بستر پر بیٹھ کر کچھ دیر تو وہ ہانپتی رہی تھیں۔ سانس کچھ متوازن ہوئی تو مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں نیچے بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگی تھی لیکن ہاتھوں میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ زور لگ ہی نہیں رہا تھا۔ پھر دادی برابر منع بھی کرتی جا رہی تھیں تو میں اٹھ کر ان کے برابر بیٹھ گئی تھی۔

''دروازے کی چٹخنی لگا دی ہے؟''

''جی.....'' میں نے آہستگی سے کہا تھا۔

''تالا اٹھا لاؤ.....'' انہوں نے لیٹتے ہوئے کہا تھا۔

''تالا.....؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔ مجھے فوراً یاد ہی نہیں آیا تھا کہ تالا تو میرے ہاتھ میں تھا جسے میں بے دھیانی اور پریشانی میں باہر ہی چھوڑ آئی تھی۔

''تمہارے ہاتھ میں تھا وہیں باہر چھوڑ آئی ہو۔'' دادی نے کہا تھا اور میں باہر کی جانب بڑھ گئی تھی۔ واپس آئی تو انہوں نے مجھے لیٹنے کے لیے کہا تھا۔ میں چارپائی ان کے برابر کھینچتے ہوئے لیٹ گئی تھی۔

''تمہارے ہاتھ میں تالا دیکھ کر میری تو جان میں جان آ گئی کہ ربّ کریم نے کسی بڑے نقصان سے محفوظ رکھا۔ تالا کیسے ڈالا تم نے اندر سے.....؟''

''باہر سے فضول قسم کے گانوں کی آواز آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے عجیب عجیب سے وہم آنے لگے تھے۔ دل سہما جا رہا تھا۔ آخر خوف اس قدر بڑھا کہ میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد باہر سے کودنے کی آواز آئی.....'' میں نے کہا تھا اور آنسو خود بخود میری آنکھوں سے اک تواتر سے بہنے لگے تھے۔ دادی اپنے کانپتے

ہاتھوں سے میرے بالوں کو سہلاتی رہی تھیں۔ کچھ دیر آنسو بہانے کے بعد میرا دل کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔

''کچھ پتا چلا کون خبیث تھے؟''

''ایک تو صابر چاچا اور دوسرا پتا نہیں کون تھا؟'' میں نے آہستگی سے کہا تھا۔

''مت کہو اس ذلیل کو چاچا..... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ایسی ذلالت پر بھی اتر سکتا ہے۔ خیر دفع کرو اور میری بات غور سے سنو۔ لڑکی جتنی بھی اچھی ہو، نیک اطوار، بلند کردار، مگر اس کی طرف اٹھی ہوئی ایک انگلی..... اس پر اچھالا گیا ایک فقرہ اس کے کردار کو پل میں مشکوک کر دیتا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنی چیخیں بھی اندر ہی گھونٹ لی تھیں اور تمہاری سسکیاں بھی دبانے کی کوشش کی تھی۔ ہمارا رونا بلکنا سن کر اگر دو چار لوگ بھی گھروں سے نکل آتے تو ہم انہیں کیا کہتے..... یہ کہ کوئی دیوار پھلانگ کر ہمارے گھر میں گھس آیا تھا اور اگر انہی ذلیلوں میں سے کوئی یا ان جیسا کوئی اور کہہ دیتا کہ ہمیں تو فضا نے خود بلایا تھا؟'' وہ انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں اور میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''سچ کہتے ہیں لوگ کہ بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں لیکن ان کے مقدر سے ڈر لگتا ہے لیکن مجھے ایسا کوئی خوف نہیں، مجھے یقین ہے میری بیٹی کا نصیب بہت اچھا ہو گا انشاء اللہ۔ حالات اچھے برے آتے رہتے ہیں، جیسے اچھے دن ہمیشہ نہیں رہتے اسی طرح برے دن بھی گزر ہی جاتے ہیں۔ بس انسان کو امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

انہوں نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا تھا لیکن میں باوجود کوشش کے مسکرا نہیں سکی تھی۔ بے بسی و بے چارگی کا اس قدر شدید احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک عجیب سا خوف تھا جو میرے پورے وجود کو اپنے شکنجے میں کس رہا تھا اور میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ دادی کو شاید میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا اور اپنے بوڑھے وجود سے لپٹا لیا تھا۔

''فضا بیٹی! ایک بات یاد رکھنا کہ پوری دنیا مل کر بھی کسی معمولی ترین بندے کو ایک ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچا سکتی جب تک اللہ نہ چاہے، بس خود کو اللہ کی امان میں دے دو اور بے فکر ہو جاؤ جو اس پر بھروسا کرتا ہے وہ اسے کبھی مایوس نہیں کرتا۔'' انہوں نے کچھ ایسے دل میں اتر جانے والے انداز میں کہا تھا کہ میں انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر وہ خاموشی سے لیٹ گئی تھیں۔ میں بھی خاموش تھی۔ میرے ذہن میں بہت سے سوال مچل رہے تھے لیکن میں انہیں لبوں پر نہیں لانا چاہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ مجھے لگتا تھا یہ سوالات دادی کو پریشان کر دیں گے۔ خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد دادی نے میری طرف دیکھا تھا اور میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''فضا! میرا خیال ہے ہمیں یہ محلہ چھوڑ دینا چاہیے۔''

''کیا کہہ رہی ہیں دادی!'' میں ایک دم متوحش ہوئی تھی۔

''بھلا ہم لوگ اور کہاں جا سکتے ہیں؟''

''اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ کہیں نہ کہیں ٹھکانا مل ہی جائے گا۔ اب کسی طرح بھی ہمارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ میرا خیال ہے میں تمہاری میڈم فریحہ کی طرف جاتی ہوں ان سے کچھ پیسے ادھار لے کر کرایہ دیتے ہیں اور انہی سے کہتی ہوں کہ کوئی دوسرا مکان دلوا دیں۔''

انہوں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

میری آنکھوں میں یکدم آنسو بھر آئے تھے۔ ان کی عمر تو نہیں تھی یوں ادھر ادھر خوار ہونے کی..... مگر میری وجہ سے ان کو یہ سب جھیلنا پڑ رہا تھا۔ اس احساس نے میرا دل بھاری کر دیا تھا۔ میں سر جھکائے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ دادی چند لمحے میرے قریب رکی تھیں، ایک لمحے کے لیے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا پھر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''چلو دروازہ اندر سے بند کر لو۔''

میں نے دھندلی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔وہ جیسے انتہائی عجلت میں تھیں لیکن دروازے کے قریب جا کر وہ جیسے ٹھٹک گئی تھیں اور میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولی تھیں۔

''سنو وہ خبیث اب نہیں آئیں گے کم از کم آج تو نہیں.....لیکن اگر خدانخواستہ ایسی کوئی بات ہو تو کھڑکی کا پٹ کھولتے ہوئے زور زور سے چور چور کہنا اور پھر پٹ فوراً بند کر دینا۔ویسے میں کوشش کرتی ہوں کہ کسی بچے سے بتول کو باہر بلوا کر اسے بتا دوں کہ تم گھر پر اکیلی ہو وہ ذرا خیال رکھے۔زندگی ہمت اور حوصلے کے ساتھ گزرتی ہے فضا! سب کچھ انشاءاللہ ٹھیک ہو جائے گا۔''میرے اترے اترے چہرے اور بھیگی آنکھوں سے نگاہ چراتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''دروازہ بند کر کے فوراً اندر چلی جاؤ اور اندر والا دروازہ بھی تب کھولنا جب میری آواز آئے۔''انہوں نے ایک دفعہ پھر مجھے تاکید کی تھی اور اللہ حافظ کہتی باہر نکل گئی تھیں۔

پھر جیسے اللہ کو ہم پر رحم آ گیا تھا اور حیرت انگیز طور پر اسی دن گھر مل گیا تھا۔میڈم فریحہ نے خود ساتھ جا کر کرایہ بھی ادا کر دیا تھا۔اور پھر رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح ہم نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا جہاں میں پیدا ہوئی تھی' جہاں میرے ماں باپ چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے رہے تھے' میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا مگر ان در و دیوار نے تو دیکھا تھا۔''

اس کی آواز یکدم بھرا گئی تھی اور مراد شاہ جو محویت کے عالم میں اس کی باتیں سن رہے تھے انہوں نے تشفی کی خاطر اس کا سر کندھے سے لگا لیا تھا اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو سہلانے لگے تھے۔

''میرے بیتے دن تو بس ایسے ہی ہیں شاہ جی! لیکن مجھے ان سے کوئی گلہ پہلے بھی نہیں تھا اور اب تو بالکل بھی نہیں ہے کیونکہ ان کا انعام آپ ہیں۔''اس نے بے حد محبت سے مراد شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا اور انہوں نے اسے پھر سے گزرے دنوں کی طرف لوٹنے کو کہا تھا۔ان باتوں میں بھلا کون سی ایسی بات تھی جو مراد شاہ کی دلچسپی کا باعث ہوتی مگر وہ محض اس کا مان بڑھانے کی خاطر اصرار کر رہے تھے تو فضا کے دل میں ان کی قدر و منزلت دوچند ہو گئی تھی۔

مراد شاہ کے ذہن میں اس وقت بہت سے ایسے لمحے تھے جب وہ سارہ شاہ کے ساتھ بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے۔اپنے والدین کی.....بچپن کی.....کالج یونیورسٹی کے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات اس سے شیئر کرنا چاہتے تھے مگر نہیں کر سکے تھے۔انہیں ہمیشہ حسرت ہی رہی تھی کہ وہ کبھی ان کی بات سنے' ان کے دل کی بات سمجھے.....مگر وہ صرف سنانے کی عادی تھی' سننا اسے آتا ہی نہیں تھا اور سنانے کے لیے بھی اس کے پاس دنیا جہان کی ہر بات ہوتی تھی بس وہ بات نہیں ہوتی تھی جو مراد شاہ سننا چاہتے تھے۔اور اگر کبھی انہوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس سے کچھ کہلوانا چاہا تھا تو بھی انہیں مایوسی ہی ہوئی تھی۔انہیں آج بھی وہ لمحہ تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔

اس دن وہ اور سارہ عمران کے ہاں ڈنر پر مدعو تھے۔عمران ان کا یونیورسٹی فیلو تھا۔اور اپنی ترقی کی خوشی میں اس نے سب پرانے دوستوں کو ڈنر دیا تھا۔سارہ اس دن بے حد خوب صورت لگ رہی تھی' یوں تو وہ تھی ہی حسین لیکن اس دن تو اس کی چھب ہی نرالی تھی۔سب اسے سراہ رہے تھے مراد شاہ کے دوست اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے اور وہ ایک مغرورانہ اور تفاخرانہ مسکراہٹ لبوں پر لیے سب کی تعریفیں وصول کر رہی تھی۔مراد شاہ کی نگاہیں دیوانہ وار اس پر نثار ہو رہی تھیں۔گھر آتے ہی اسے ہمیشہ چینج کرنے اور میک اپ صاف کرنے کی جلدی ہوتی تھی.....اس دن وہ چینج کر کے آئی تو مراد شاہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''یار! آتے ہی تم یوں ڈریسنگ روم کی طرف بھاگتی ہو جیسے کوئی تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔یہ نہیں کہ دو گھڑی اس بے چارے محبت کے مارے شوہر کے پاس بیٹھ کر اسے درشن کروا دو۔''انہوں نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے سیٹی پر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

''اور وہ جو دو گھنٹے سے یہ بے چارہ شوہر صرف اس چہرے پر ہی نگاہ جمائے رہا ہے وہ.....سچ میں تو سوچ رہی تھی' آج آپ ضرور مجھے نظر لگا کر چھوڑیں گے۔''وہ بے حد ناز سے مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''محبت کرنے والوں کی نظر نہیں لگتی جناب!''انہوں نے مخمور لہجے میں کہا تھا۔

''آج میں ایک نظم پڑھ رہا تھا جس کا ''محبت'' عنوان تھا۔ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے تمہیں سنانے کے لیے یاد کر لی۔

محبت اک کہانی ہے
محبت اک فسانہ ہے
محبت اک حسیں نغمہ!
محبت اک ترانہ ہے!
اگر دل، دل سے مل جائے
اگر موسم سہانا ہو.....!
کہیں کوئل کی کوکو ہو.....
کوئی لمحہ چرانا ہو.....
کسی کو آزمانا ہو.....
کسی کو کچھ بتانا ہو.....
کسی سے جیت کر بھی گر
کسی سے ہار جانا ہو
کوئی گر روٹھ جائے تو
اسے پھر سے منانا ہو
تو دل کے ساز پر ہمدم
کوئی نغمہ سنا ڈالو.....!

کچھ تو نظم تھی ہی دل کو چھو لینے والی اور کچھ ان لمحوں کا اثر تھا۔ دریچے سے ٹکراتی بارش کی بوندوں نے جیسے ماحول کو کچھ اور پر فسوں بنا دیا تھا۔ مراد شاہ خود کو اک عجیب سے سحر میں گھرتا محسوس کر رہے تھے۔

تمہارے دل میں کیا کیا ہے
اسے سب کچھ بتا ڈالو!
نہ کہہ پاؤ زباں سے گر!
نگاہوں ہی سے کہہ ڈالو
محبت اک طاقت ہے
محبت اک صداقت ہے
محبت اک راحت ہے
محبت اک رفاقت ہے

محبت زندگانی ہے
محبت ہی زمانہ ہے
محبت اک حقیقت ہے
یہی سب کو بتانا ہے

بے حد والہانہ نگاہوں سے اسے دیکھتے وہ اک جذب کے عالم میں سنا رہے تھے۔ ''کیسی ہے.....؟'' اس کی مسلسل خاموشی پر انہوں نے جھک کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے ان کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ ان کے کندھے پر سر رکھے وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ ساکت نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کا دل خاک ہو اجا رہا تھا۔ کوئی یوں بھی کسی کے ساتھ کر سکتا ہے' اس قدر بے حسی' انہیں جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا' مگر وہ سارہ شاہ تھی اور اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ جانے ہر بار وہ یہ کیوں بھول جاتے تھے۔ باہر بارش یونہی موسلا دھار برس رہی تھی اور ان کے دل میں صحرا سائیں سائیں کر رہا تھا۔

''کیا ہوا شاہ جی!'' فضا ان کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھ کر فکر مند ہو گئی تھی۔

''کچھ نہیں' بس یونہی کچھ یاد آ گیا تھا۔'' انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا پھر تم لوگ نئے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے.....؟'' انہوں نے یادوں کا سلسلہ وہیں سے جوڑنا چاہا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہ اس سے اس کے دکھ سکھ سن کر اس کا دل ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ اسے اپنائیت و رفاقت کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ فضا پہلے تو گومگو کی کیفیت میں انہیں دیکھتی رہی تھی پھر انہیں منتظر دیکھ کر ان کے ہاتھ کو اپنے رخسار پر رکھتے ہوئے ان تکلیف اور مشقت بھرے دنوں کو یاد کرنے لگی تھی جن کا انعام یہ راحتیں تھیں۔

نیا گھر گو پہلے والے سے کچھ بہتر ہی تھا مگر پھر بھی چند دن تو بہت عجیب عجیب سا محسوس ہوتا رہا۔ ہر وقت کے ڈر و خوف سے نجات مل گئی تھی مگر وہ گھر جہاں میں نے ہوش سنبھالا تھا' بچپن گزارا تھا' اسے چھوڑنے کا دکھ بھی تھا۔ میڈم فریحہ نے مجھے سلائی کڑھائی کا کورس کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر دادی مجھے باہر بھیجنے کے حق میں نہیں تھیں اور میرے اپنے خیال میں بھی یہی بہتر تھا۔ میڈم فریحہ نے ہمیں مہینے بھر کا راشن ڈلوا دیا تھا۔ دادی اور میں ان کے بے حد ممنون تھے' مگر آئندہ ہم نے کس طرح گزر بسر کرنی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میرا دھیان تو ہر وقت بس اسی مسئلے کی طرف لگا رہتا تھا' البتہ دادی کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کس حد تک فکر مند تھیں۔ کبھی کبھی وہ کسی گہری سوچ میں ضرور دکھائی دیتی تھیں لیکن میں جب بھی یہ موضوع چھیڑتی تھی' وہ مجھے سکون سے تسلی اور دلاسے دینے لگتی تھیں اور کسی وقت ایک دو گھنٹے کے لیے باہر چلی جاتیں' گھر میں ہوتیں تو ''یا رزاق'' اور ''یا وھاب'' کا ورد کرتی رہتیں۔

اس دن بھی جب وہ مجھے دروازہ بند کرنے کو کہتے ہوئے نکلنے کو تھیں تو میں ایک دم روہانسی ہوئی تھی۔

''دادی! آپ گھر میں ہوتی ہیں تو ہر وقت بس کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہیں یا پھر کچھ بھی بتائے بغیر باہر چلی جاتی ہیں۔ کچھ بتائیں تو سہی کہ آخر آپ کدھر جاتی ہیں اور یہ چیزیں آخر کب تک چلیں گی۔ اس کے بعد کہاں سے کھائیں پئیں گے؟'' انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا تھا پھر پلٹ کر میرے قریب آ گئی تھیں۔

''فضا بیٹی! اللہ کا ذکر کرتی رہتی ہوں تو وہ بھی کھانے پینے کے انتظام کے لیے ہوتا ہے اور.....''

''دادی! اگر گھر میں بیٹھ کر صرف اللہ کا ذکر کرنے سے سب کچھ ملنے لگے تو پھر کوئی باہر نکل کر نوکری کیوں کرے؟'' میں اس دن بری طرح جھنجلائی ہوئی تھی اس لیے درمیان میں ہی دادی کی بات کاٹ دی تھی۔

''فضا! یہی تو ہم لوگوں کی غلطی ہے بیٹی!'' انہوں نے تاسف سے مجھے دیکھا تھا۔ ''ہم نماز سے' قرآن سے اور اللہ کے ذکر سے جنت کے ملنے کا تو یقین رکھتے ہیں مگر روزی کے ملنے کا یقین نہیں رکھتے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمیں نوکری کے ذریعے تو ضرورتیں پوری ہونے کا یقین ہے مگر اپنے جن ناموں کے ورد سے اس مالک کل نے

خودروزی دینے کا وعدہ کیا ہے تو اس وعدہ کا ہمیں یقین نہیں....." دادی کہہ رہی تھیں اور میں کچھ شرمندہ کچھ حیران سی انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

اور اس سے اگلے ہی دن جب میں اور دادی صحن میں بیٹھے تھے تو دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ میں اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ دادی کی تاکید تھی کہ میں کم سے کم لوگوں کے سامنے آؤں اور میں خود بھی اب اس معاملے میں خاصی محتاط ہوگئی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ اس نئے محلے میں کسی کو بھی پتا چلے کہ اس بوڑھی کمزور عورت کی نوجوان پوتی بھی ہے۔ چند ہی لمحوں کے بعد دادی ہانپتی کانپتی مختلف شاپر ہاتھوں میں اٹھائے اندر داخل ہوئی تھیں۔ ڈھیر سارے مٹر اور لہسن دیکھ کر میں حیران ہوئی تھی۔

"دادی یہ سب.....؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

"دھیرج بیٹی! دھیرج۔" دادی کے چہرے پر بے حد چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "باہر کچھ اور شاپر پڑے ہیں' اٹھالاؤ۔" انہوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا اور میں حیرانی سے انہیں دیکھتی باہر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"ہاں تو فضا بیٹی یہی تھا وہ انتظام جس کی تلاش میں' میں روز گھر سے نکل جاتی تھی' روزی روٹی کے لیے اللہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ حیلہ تو بندے کو کرنا پڑتا ہے' وسیلہ پھر وہ ربّ کریم خود بنا دیتا ہے۔ تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ ابھی مجھے خود پتا نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے' بس ادھر ادھر لوگوں سے مل ملا کر یہ دیکھتی تھی کہ ایسا کیا کام ہوسکتا ہے جو ہم گھر بیٹھے کرسکیں۔ کل اس سبزی والے سے بات ہوئی تھی۔ اچھا نیک شخص لگ رہا تھا' وہ روز مٹر' لہسن بھیج دیا کرے گا اور چھلا ہوا واپس منگوا بھی لے گا۔ کہہ رہا تھا اگر آپ کہیں گی تو اور بھی دکانداروں سے لے دوں گا۔ اللہ کے حکم سے اتنے پیسے مل جایا کریں گے کہ ہمارا گزارہ ہوجائے گا۔"

انہوں نے بے حد طمانیت سے کہا تھا اور میں نے بھی سکون کی سانس لی تھی۔ پھر کچھ سال ایک ہی ڈگر پر چلتے گزر گئے تھے صبح سے شام تک ایک لمحہ فرصت میسر نہیں ہوتی تھی۔ محنت سے میں جی چراتی تھی نہ تھکتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی دل چاہتا تھا کہ باہر نکلوں' اپنی کسی ہم عمر سے ملوں' باتیں کروں..... مگر پھر گزرے دنوں کی تلخ اور خوفناک یاد مجھے کپکپا کر رکھ دیتی تھی اور میں دل میں ابھرنے والی خواہش کو دل میں ہی دفن کر دیتی تھی۔ اور پھر کئی سالوں کے بعد معمول بھی بدل گیا تھا مگر ایسے کہ جیسے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ نوردین بابا جنہوں نے ان ماہ و سال میں ہمارا بہت ساتھ دیا تھا۔ وفات پا گئے تھے۔ ان کے بیٹوں نے سبزی کی دکان فروخت کر دی تھی۔ انہی دنوں دادی سخت بیمار ہوگئی تھیں اور میں شدید پریشان تھی۔ ایک دو ماہ تو آرام سے گزر گئے تھے' کرایہ بھی دیا گیا تھا اور گھر کا خرچ بھی چلتا رہا تھا۔ دادی کے نہ نہ کرنے کے باوجود ان کی دوائیں بھی میں زبردستی منگواتی رہی تھی۔ لیکن تیسرا مہینہ شروع ہوتے ہی میری پریشانی میں انتہائی اضافہ ہوگیا تھا کیونکہ تمام جمع بچت تو ختم ہونے والی تھی۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور دادی کا بخار اور کھانسی ٹھیک ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی تھی۔ تیسرا مہینہ ہم نے کیسے گزارا تھا یہ صرف ہم ہی جانتے تھے۔ بس یہ شکر تھا کہ مالک مکان سے اگلے ماہ کے لیے مہلت مل گئی تھی۔ لیکن اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اگلے ماہ کی پہلی تاریخ کو اسے دونوں ماہ کا کرایہ مل جانا چاہیے ورنہ دو تاریخ کو اس کا گھر خالی کر دیا جائے یا پھر دوسری صورت میں وہ خود آ کر سامان باہر پھینک دے گا۔ اور اس جیسے بدمزاج اور سخت دل آدمی سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ کرائے کا انتظام بھلا کہاں سے ہونا تھا' ہمیں تو روٹی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اکیس تاریخ تک جب اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو میں اور دادی فریحہ میڈم کے گھر گئے تھے۔ دادی سے اب اکیلے دو چار قدم سے زیادہ چلا نہیں جاتا تھا۔

میڈم فریحہ کے گھر کے دروازے پر پڑا تالا دیکھ کر ہمارے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ ادھر ادھر سے پوچھنے پر ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا تھا اور ہم ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے تھے۔ پھر دو تاریخ آ گئی تھی۔ مالک مکان نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا اور اللہ نے اپنا کام کر دکھایا تھا....." کھوئے کھوئے اور سنجیدہ سے انداز میں یادوں کی راکھ کریدتے کریدتے یکدم وہ خوشدلی سے مسکرائی تھی۔

"ویسے شاہ جی' یہ اللہ ہی کی قدرت ہے کہ ایک انسان کی سنگدلی کو دوسرے انسان کے لیے باعث انعام بنا دیتے ہیں۔ میں تو کئی مرتبہ وزیر دین کے لیے دعا کرتی ہوں کہ جس نے ہمارا سامان اٹھا کر باہر پھینکا اور آپ کو ملانے کا سبب بنا..... بددعاؤں کے بجائے دعائیں..... ہے نا عجیب بات!" بے حد خوب صورت سی مسکان لیے وہ ان سے

پوچھ رہی تھی۔آنکھوں میں جیسے جگنو سے چمک رہے تھے۔لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی فضا تھی جسے انہوں نے کل انتہائی خستہ اور شکستہ حالت میں دیکھا تھا۔

"بے حد....." مراد شاہ نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اور جناب ہماری اس داستان محبت میں کیا عجیب نہیں..... ذرا یہ تو بتا دیں۔"

"صرف عجیب.....! عجیب وغریب.....اس ناچیز بندی نے اپنا دل آپ کے قدموں میں نچھاور کر دیا اور آپ نے نگاہ تک ڈالنا گوارا نہ کی۔"

"بہت بڑی خطا ہو گئی سرکار! بندہ ہر قسم کی سزا کے لیے تیار ہے۔" انہوں نے شوخی سے سر خم کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں.....سزا تو آپ کو ضرور ملے گی۔"

"دل وجان سے سہیں گے جناب۔" مسرت وطمانیت سے سرشار مراد شاہ جیسے اس پر تمام زندگی نچھاور کرنے کے لیے تیار تھے۔

"بس صرف اتنا کہ کچھ دیر کے لیے اس جگہ پر لے چلیں جہاں پہلی بار میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ایک ایسا انسان جو فرشتوں جیسا تھا' ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ انسان بھی ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔"

اس نے بے حد جذب کے عالم میں کہا تھا اور مراد شاہ اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔

"میرے ایک چھوٹے سے عمل سے تم نے مجھے اتنا بلند مرتبہ کیسے دے ڈالا فضا؟" چند لمحوں کے بعد انہوں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"ایک عمل تھوڑا ہی شاہ جی' ڈھیروں ایسی باتیں بتاتے تھے ذوالفقار چاچا آپ کے بارے میں' ان چھ ماہ کے بعد جب ذوالفقار چاچا اور ان کی بیوی دادی کے بے حد منع کرنے کے باوجود زبردستی کرایہ دے گئے تو دادی سے مجھے پتا چلا کہ وہ لوگ ہماری ہی گلی میں رہتے تھے۔

میں نے دادی کو منا کر ان کے گھر آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ان کی بیوی سے مجھے آپ کے اور سارہ باجی کے متعلق تمام معلومات ملتی رہتی تھیں۔انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ آپ بہت نیک دل انسان ہیں ذوالفقار چاچا آپ کی فیکٹری میں کام کرتے تھے پھر جب انہیں دمے کے مرض نے گھیرا اور وہ نوکری کرنے کے قابل نہ رہے تو آپ گھر بیٹھے انہیں ہر ماہ تنخواہ کے ساتھ ساتھ علاج کا خرچ بھی گھر پہنچا کے جاتے تھے۔یہی نہیں آپ ایسے نیک کاموں میں بڑھ چڑھ کر امداد دیا کرتے۔ذوالفقار چاچا کے پاس کئی اخبار تھے جن میں آپ کی تصویریں آپ کی خدمات کی خبریں درج تھیں۔میں نے اخبار کی تصویر ہی میں سارہ باجی کو بھی دیکھا تھا۔آپ کے متعلق سب کچھ جان کر آپ کی مسلسل تعریفیں سن سن کر میری محبت ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی چلی گئی تھی۔عجیب تھی یہ محبت.....جس میں نہ کوئی توقع تھی نہ غرض.....

نہ دیکھنے کی چاہ تھی نہ حاصل کرنے کی تمنا.....

اگر کوئی آرزو تھی تو آپ کی خوشیوں کی۔آپ کی زندگی کی راحتوں کی۔

ان دنوں میں ہر گھڑی' ہر لمحہ آپ کے اور سارہ باجی کے لیے ایک ہی دعا کرتی تھی' یہ دعا میں نے گویا ورد بنا لی تھی کہ یا اللہ! مجھے تجھ سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے کہ تو شاہ جی کی زندگی کی اس کمی کو دور کر دے' انہیں صاحب اولاد کر دے' کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں اتنی بار سانس نہیں لیتی تھی جتنی بار یہ دعا کرتی تھی۔"

اس کا لہجہ جیسے فسوں پھونک رہا تھا۔

لفظ سحر طاری کر رہے تھے۔

اور تبھی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا اور سارہ شاہ آندھی اور طوفان کی مانند کمرے میں داخل ہوئی تھی۔یوں اچانک اسے سامنے دیکھ کر چند لمحے تو مراد شاہ ششدر سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔فضا کے کندھے پر رکھا ان کا ہاتھ بے ساختہ اٹھا تھا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔وہ تیزی سے اس صورت حال پر غور کر رہے تھے جس کا سامنا تو انہیں بہر حال کرنا ہی تھا۔مگر اس طرح اور اس قدر جلد' یہ وہ توقع نہیں کر رہے تھے پھر سارہ کی اس گھر میں آمد.....! وہ الجھ کر رہ گئے تھے۔

''کون ہے یہ.....؟'' وہ غیظ وغضب میں بھری ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
مرادشاہ نے فضا کی جانب دیکھا تھا۔اس کی سنہری مائل رنگت پیلی زرد ہو رہی تھی۔ایک لمحہ قبل جو آنکھیں مسرت وطمانیت سے مسکرا رہی تھیں اب خوف وہراس سے پھیلی ہوئی تھیں۔
''یہ فضا ہے.....فضا مرادشاہ۔'' سارہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے انہوں نے پرسکون لہجے میں کہا تھا اور وہ جیسے غم وغصے سے پاگل ہوگئی تھی۔اگلے ہی پل چیل کی طرح فضا پر جھپٹتے ہوئے وہ جو اس کے منہ میں آ رہا تھا کہے جا رہی تھی۔مرادشاہ نے بمشکل کھینچ کر اسے فضا سے علیحدہ کیا تھا لیکن اس پر تو جیسے جنون سوار تھا' اس نے ایک جھٹکے سے اپنے بازوان کی گرفت سے چھڑا لیے تھے اور دوبارہ فضا پر پل پڑی تھی۔
''رک جاؤ سارہ! اب اگر ایک قدم بھی تم نے فضا کی طرف بڑھایا تو میں.....'' انہوں نے ایک نظر چپ چاپ پٹتی فضا پر ڈالتے ہوئے سخت اور سرد لہجے میں تنبیہہ کرتے ہوئے پوری طاقت سے اسے پیچھے کھینچا تھا۔
''تو آپ کیا کریں گے.....بتایئے.....بتایئے کیا کریں گے؟'' وہ تن کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور شعلہ بار نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے غرائی تھی۔
''میں.....میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔'' انہوں نے بے حد ٹھنڈے لہجے میں ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

''طلا.....ق.....اور اس بھکارن کی خاطر.....؟'' وہ جیسے شدید شاک میں تھی۔
''ہاں' اسی بھکارن کی خاطر.....کیونکہ اسی بھکارن نے چھ سال پہلے تمہارے شوہر کو زندگی کی بھیک دی تھی' اور پھر اسی نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو تمہارے دامن میں ڈال دیا تھا۔برابر کی حق دار اور حصہ دار ہوتے ہوئے بھی تمہاری راہ سے خاموشی سے ہٹ گئی تھی۔'' وہ فضا کے کانپتے وجود کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر ایک ایک لفظ چبا کر کہہ رہے تھے۔مگر سارہ شاہ کی سماعت تو جیسے اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔وہ ساکت وجامد کھڑی ایک ٹک ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ان آنکھوں کو اس نے پچھلے پندرہ برسوں میں کبھی اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا لیکن ان آنکھوں کے ایک ایک رنگ سے وہ بخوبی واقف تھی.....مگر یہ کون سا رنگ تھا.....اسے تو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا.....کبھی نہیں برتا تھا' اس سے تو وہ آشنا ہی نہیں تھی۔ہمیشہ محبتوں میں گھری رہنے والی سارہ شاہ نفرت کے اس رنگ کو تو پہچانتی ہی نہیں تھی۔
مگر پھر سارے وجود میں درد ہی درد کیوں پھیلتا جا رہا تھا۔
دل کیوں یوں کٹ رہا تھا۔
رگیں کیوں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔
روح کیوں جسم کا ساتھ چھوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔
اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی اپنی تمام تر حسیات مرکوز کرتے ہوئے مرادشاہ کی بات سننے کی سعی کی تھی لیکن ایک گہرے درد شدید کرب نے کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر کر دیا تھا۔
اگلے ہی لمحے وہ مٹی کے بے جان تودے کی مانند زمین پر آن گری تھی۔

.....☆☆☆.....

ہوش وخرد سے رابطہ استوار ہوا تو سارہ شاہ کو پتا چلا تھا کہ شدید نروس بریک ڈاؤن سے انچاس گھنٹے بیہوش رہنے کے بعد وہ ہوش میں آئی تھی۔
''کاش! میں کبھی ہوش میں نہ آتی۔'' یہ پہلا خیال تھا جو آنکھیں کھولتے ہی اس کے ذہن میں آیا تھا۔مرادشاہ جو اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھے تھے' اسے ہوش میں آتے

دیکھ کر لپک کر اس کی طرف بڑھے اور بے حد ملائمت سے اس کا ہاتھ تھام کر کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے انہیں پیچھے ہٹ جانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم سے اس کے پاس کھڑے رہے تھے اور پھر خاموشی سے باہر نکل گئے تھے۔ امریکا سے اس کے دونوں بڑے بھائی اور بھابیاں اپنے بچوں کے ساتھ پہلے ہی پاکستان آئے ہوئے تھے۔ بہروز بھی بہن کی بیماری کی اطلاع ملتے ہی فوراً آ پہنچا تھا۔ سب اس کے پاس آ رہے تھے۔ اسے پیار کر رہے تھے اس کے ہوش میں آنے پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر وہ تو جیسے حواس میں ہوتے ہوئے بھی کچھ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ لیکن نہیں' ایسا نہیں تھا..... اگر وہ کچھ محسوس نہ کر رہی ہوتی تو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے وہ گرم گرم سیال مادہ نہ بہہ رہا ہوتا جس نے اس کا تکیہ گیلا کر دیا تھا۔

سب کے مل لینے کے بعد ایک بار پھر مراد شاہ اس کے قریب آئے تھے۔

"سارہ! بس ایک بار میری پوری بات سن لو پلیز۔ پھر تم جو کہو گی ہم وہی کریں گے۔ میں اور فضا....." وہ بے حد لجاجت بھرے لہجے میں کہتے کہتے یکدم خاموش ہو گئے تھے۔ اس کے مسلسل نفی میں ہلتے سر اور بند آنکھوں نے انہیں جملہ مکمل نہیں کرنے دیا تھا۔ اس کے چہرے پر اس قدر تکلیف کے آثار تھے کہ ان کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔

وہ انہیں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ ان سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ان کی وہاں موجودگی اس کے لیے اذیت کا باعث تھی اور اس کی یہ کیفیت اس کی صحت پر اثر انداز ہو سکتی تھی اس سوچ کے ساتھ ہی وہ چپ چاپ اٹھے اور باہر نکل آئے۔ تھکے تھکے قدموں سے چلتے وہ کوریڈور میں ٹہلتے' بہروز ہاشمی اور لکی کے پاس چلے آئے۔

"آپ لوگ تو ادھر ہی ہیں' میں سوچ رہا تھا کچھ دیر کے لیے گھر چلا جاؤں شاور وغیرہ لے کر چینج کر کے پھر آ جاؤں گا۔"

بہروز ہاشمی نے قدرے سنجیدگی کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔ لکی نے سرد نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا اور وہ اس سے نگاہ چراتے ہوئے مضمحل سے قدموں سے شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

جس وقت وہ گھر پہنچے طبیعت پر بے حد پژمردگی طاری تھی۔ دل و دماغ جیسے کسی نادیدہ سے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ سارہ ان سے لڑتی' جھگڑتی' ناراض ہوتی' ان پر غصہ نکالتی تو شاید وہ اتنا مضطرب نہ ہوتے' مگر اس کی بیماری اور مسلسل خاموشی نے انہیں جس کیفیت کا شکار کیا تھا' وہ ان کے لیے بے حد تکلیف دہ تھی۔ فضا ان کی گاڑی کی آواز سنتے ہی تیزی سے باہر کی طرف بڑھی تھی مگر ان کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے قدم ایک دم سست پڑ گئے تھے۔

"کیا ہوا شاہ جی! کیا سارہ باجی ہوش میں آ گئیں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مراد شاہ نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ "پھر..... آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟" ان کے چہرے پر نگاہ جمائے وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

"اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی بلکہ اس نے کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی اور میری طرف تو اس نے دیکھا تک نہیں۔" گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ تھکے تھکے قدموں سے اندر کی جانب بڑھے اور لاؤنج میں پڑے صوفے پر خود کو گرا دیا۔

فضا چند لمحے خاموش کھڑی ان کو دیکھتی رہی تھی پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے بڑھی تھی اور ان کے برابر بیٹھتے ہوئے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے شاہ جی!" آہستگی سے کہتی وہ خود کو حقیقتاً مجرم محسوس کر رہی تھی۔ مراد شاہ ایک دم سیدھے ہوئے اور ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"نہیں فضا! ایسا نہیں ہے اور ایک بات یاد رکھو کہ انسان کے ساتھ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں اس کی اپنی ہی کوتاہیوں کا عمل دخل ہوتا ہے چلو چھوڑو ان باتوں کو تم یہ بتاؤ کہ تم نے کھانا کھا لیا؟" اس کے مرجھائے مرجھائے سے چہرے کو دیکھتے ہوئے انہیں جیسے یکدم خیال آیا۔

"نہیں۔" فضا نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ فریش ہو جائیں پھر مل کر کھاتے ہیں۔"

وہ چند ثانیے اسے دیکھتے رہے تھے پھر اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ فضا اس ساری صورت حال میں خود کو قصوروار گردان رہی تھی جبکہ مراد شاہ کے لیے یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ اپنی فطری نرم دلی کی وجہ سے وہ بے حد مضطرب تھے اور سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ سارہ ان پر بگڑے گی لڑے جھگڑے گی انہیں برا بھلا کہے گی اور وہ کسی نہ کسی طرح اسے منا ہی لیں گے۔ لیکن یہ سب کچھ جو ہوا تھا ان کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اپنے انہی خیالات کا اظہار انہوں نے فضا سے کیا تھا تو وہ ایک دم آبدیدہ ہو گئی تھی۔

"شاہ جی! سارہ باجی آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ اپنی محبت میں کسی اور کی حصے داری وہ برداشت نہیں کر پائیں۔ آپ کیوں اپنی خوش گوار زندگی میری خاطر خراب کرتے ہیں؟ آپ بس کسی بھی طرح انہیں منا لیں انہیں بتا دیں کہ میں آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔ میرا کیا ہے شاہ جی مجھے تو عادت ہے دل کو مارنے کی اپنی خواہشات کو دل میں ہی دفن کرنے کی میں نے سخت غلطی کی جو....." وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مراد شاہ کچھ دیر ساکت آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے تھے پھر آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"تمہیں ہو گی عادت ہر طرح کے حالات میں رہنے کی اپنی خواہشات مارنے کی لیکن اب تمہیں یہ عادت بدلنا پڑے گی تمہیں بار بار مجھے یہ باور کرانا ہو گا بار بار اس خواہش کا اظہار کرنا ہو گا کہ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ کہو..... کہو نہیں رہ سکتیں تم میرے بغیر!"

اس کے کندھوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لیے وہ چلانے کے سے انداز میں کہہ رہے تھے۔ فضا رونا دھونا بھول کر حیران و پریشان سی پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھنے لگی تب وہ سنبھلے اور اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے اور اک گہرا سانس لیتے ہوئے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "دوبارہ کبھی جانے کی بات مت کرنا تم شاید میرے بغیر رہ لو مگر میں نہیں رہ سکتا اب یہ یاد رکھنا۔" ٹھہرے ٹھہرے گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ فضا کو بے حد مضطرب نظر آئے تھے۔ فضا کے بس میں ہوتا تو وہ کسی بھی طرح سے ان کی ساری بے چینی سارا اضطراب اپنے دل میں سمیٹ کر انہیں پہلے کی طرح خوش و خرم کر دیتی مگر وہ اس وقت خود کو بہت بے بس پا رہی تھی۔

.....☆☆☆.....

"ڈاکٹر! اس کمرے میں میری بیگم تھیں؟"

وہ اسپتال آئے تو سارہ کے کمرے میں بیڈ پر دراز لڑکے اور اس کے سرہانے کھڑے ڈاکٹر کو چند لمحے حیرت سے دیکھتے رہے تھے پھر بمشکل حلق سے آواز نکالی تھی۔

"وہ تو شام کو ہی چلی گئی تھیں۔"

"جی....." وہ ششدر سے ڈاکٹر کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر جھک کر بچے کو چیک کرنے لگا تھا اور وہ مرے مرے قدموں سے کمرے سے نکل آئے تھے۔

"مراد بھائی سارہ امجکشنز کے زیر اثر سو رہی ہے ڈاکٹر کا خیال ہے اسے صبح سے پہلے پریشان نہ کیا جائے۔ اس لیے آپ اب گھر پر ہی آرام کریں صبح آ جایئے گا۔" ککی نے انہیں فون پر کہا تھا۔

وہ شیشے کا دروازہ کھول کر کاریڈور سے نکلے تو ان کے اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی یقیناً ککی نے یہ سب ان سے سارہ کی خواہش پر ہی کہا ہو گا۔ بالوں میں انگلیاں الجھاتے خالی الذہنی کی سی کیفیت میں وہ اسپتال سے نکل آئے تھے۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ مسلسل غور کرتے رہے تھے کہ انہیں سارہ سے کیسے بات کرنی چاہیے کیا کہنا چاہیے جو اس کے غصے اور رنج کی شدت کو کچھ کم کر دے وہ ٹھنڈے دل سے سارے معاملے پر غور کرنے کے لیے تیار ہو جائے گو یہ سب انہیں بے حد مشکل بلکہ ناممکن نظر آ رہا تھا لیکن وہ پھر بھی خود کو امید اور حوصلہ دلائے "سارہ منزل" کی طرف رواں دواں تھے۔ گیٹ پر چوکیدار نہیں تھا۔ انہوں نے ایک دو بار ہارن دینے کے بعد گاڑی سے اتر کر بیل بجائی تھی۔ پھر گاڑی میں آ بیٹھے تھے۔ چند لمحوں کے بعد چوکیدار حیران حیران سا گیٹ کھول کر باہر نکلا تھا۔

''السلام علیکم صاحب جی!''

''وعلیکم السلام.....!'' مراد شاہ نے الجھن بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔ بات تھی بھی حیرانی والی کہ گیٹ کھولنے کے بجائے وہ باہر آ کر سلام کر رہا تھا۔

''تو کیا اب اس گھر میں ان کا داخلہ بھی ممنوع ہو چکا تھا۔'' انہوں نے بے یقینی سے سوچا تھا۔

''صاحب! گیٹ کھولوں جی اندر آئیں گے؟'' انہیں مسلسل گیٹ کی جانب دیکھتے پا کر اس نے الجھے الجھے لہجے میں پوچھا تھا۔

''تو اور تمہارے سر میں جاؤں گا۔ فوراً گیٹ کھولو۔ بے وقوف آدمی! خبردار جو دوبارہ میرے آنے پر یوں کھڑے ہو کر سوال جواب کیے۔'' شدید غصے اور رنج کے عالم میں وہ تقریباً دہاڑے تھے۔

''ایک منٹ صاحب میں ابھی چابی لایا۔'' وہ بے چارہ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہتا بھاگتا ہوا اندر گیا۔

''چابی!'' زیر لب کہتے ہوئے مراد شاہ نے گیٹ کی جانب دیکھا تھا۔ موٹا سا تالا ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اس موٹے سے سیاہ تالے پر نگاہیں جمائے عجیب بے بسی کی کیفیت میں تھے۔

ثمین کا میکہ تو امریکا میں ہی تھا اور بڑی دونوں بھابیوں کے میکے سارہ کو عام دنوں میں جانا پسند نہیں تھا کجا کہ بیماری کی حالت میں یقیناً وہ لوگ کسی ہوٹل میں گئے تھے۔ مگر وہ اب انہیں کیسے تلاش کرتے۔ شام کو کئی کے فون اور پھر شام کو ہی اسپتال سے چلے جانے کا مطلب بخوبی ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ سارہ نہ ان سے بات کرنا چاہتی تھی اور نہ ملنا چاہتی تھی۔ اور جب تک وہ نہ چاہتی اس کے بھائیوں اور بھابیوں میں سے کوئی ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے سہروز ہاشمی کا نمبر ملایا تھا۔ بیل گئی تھی اور پھر فوراً ہی فون بند کر دیا گیا تھا۔ ایک گہری ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے انہوں نے گاڑی ریورس کی تھی اور تبھی چوکیدار اندر سے نکل آیا تھا۔ انہیں گاڑی ریورس کرتے دیکھ کر وہ بھاگتے ہوئے ان کی جانب بڑھا تھا۔

''صاحب جی! آپ واپس جا رہے ہیں؟''

''ہاں ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔'' آہستگی سے کہتے ہوئے انہوں نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی تھی۔

پھر اگلے کئی دن وہ روز ''سارہ منزل'' کا چکر لگاتے رہے تھے دن میں کئی کئی بار سہروز ہاشمی، ثمین اور سارہ کے فون پر رابطہ کرتے رہے تھے مگر سوائے ناکامی اور مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ سارہ کے سیل فون پر بار بار ایس ایم ایس کیے تھے مگر ادھر ہنوز ایک ہی جواب تھا گہری خاموشی..... آخر تنگ آ کر انہوں نے بھی چپ سادھ لی۔ کسی کسی وقت تو انہیں خود پر ہی غصہ آتا تھا کہ آخر وہ کیوں اتنے حساس تھے۔ کیوں انہیں ہر دم دوسروں کی رنجیدگی کا ان کی خوشی کا خیال رہتا تھا۔ وہ کیوں عام لوگوں کی طرح صرف اپنی خوشی کو پیش نظر رکھ کر باقی ہر طرف سے آنکھیں نہیں پھیر پاتے تھے۔ سارہ کو خوش رکھنے کے لیے انہوں نے کیا نہیں کیا تھا۔ اپنی ہر خواہش ہر آرزو کو دل میں ہی مار دیا تھا۔ اس نے تو شاید کبھی لمحہ بھر کے لیے بھی ان کے بارے میں ایسے نہ سوچا ہو جیسے وہ سوچتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ وہ اسے یوں سر پر سوار نہیں کریں گے۔ فضا کے ساتھ خوش رہنے اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کریں گے۔ فضا کے خیال کے ساتھ ہی ایک نرم سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر در آئی تھی۔ وہ کتنی فکرمند تھی سارہ کے لیے، ان کے لیے، وہ ان کی خوشیوں کی خاطر خود کو ان کی راہ سے ہٹا لینا چاہتی تھی۔ ان کی ساری تسلیوں اور یقین دہانیوں کے باوجود وہ یوں ان کی زندگی میں آ کر پریشانیوں کا سبب بن جانے پر نادم ہوتی تھی۔

''کاش سارہ میں بھی ذرہ برابر ہی سہی احساس نام کی کوئی چیز ہوتی تو حالات اس نہج پر کبھی نہ آتے۔'' انہوں نے تاسف سے سوچا۔

انہیں سر شام گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر فضا کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو حیرانی جھلملائی تھی پھر فوراً ہی نرم سی مسکراہٹ لبوں پر لیے وہ آگے بڑھی اور بریف کیس ان کے

ہاتھوں سے لے لیا۔

''مائی ڈیئر وائف جلدی سے تیار ہو جاؤ بہت دنوں کے بعد آج اس قدر خوشگوار موسم ہے فائدہ اٹھانا چاہیے۔شاپنگ کریں گے ڈنر بھی باہر ہی ہوگا اور پھر لانگ ڈرائیو۔''

اسے بازو کے حصار میں لیتے ہوئے انہوں نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔وہ مسکرانے کی خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر آنکھوں کی وہ چمک مفقود تھی جو پہلے دو دن ہر وقت نظر آتی رہی تھی۔

مراد شاہ نے ایک دم دل پر اک بھاری بوجھ گرتا محسوس کیا تھا۔انہیں یوں محسوس ہوا تھا کہ حقیقی مسرت اور خوشی کے جیسے بس وہی دو دن تھے جو بیت گئے تھے۔وہ آہستگی سے اس کے رخسار کو تھپتھپاتے بوجھل قدموں سے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔

.....☆☆☆.....

بہت سے بے رنگ دنوں کے بعد جب وہ لوگ ایک اچھی شام گزارنے کے خیال سے باہر نکل رہے تھے تو مراد شاہ کا فون بج اٹھا تھا۔ثمین کا نمبر دیکھ کر وہ چونکتے ہوئے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

ان کی بے شمار کالز کے جواب میں مکمل خاموشی کے بعد سارہ کی طرف سے کسی فرد کی یہ پہلی کال تھی۔سارہ کے سب گھر والوں میں سے ثمین کو اس سارے معاملے میں ان سے ہمدردی تھی۔یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سارہ کے بعد سب سے زیادہ کوشش بھی ثمین سے رابطے کے لیے کی تھی مگر اس کی سرد مہری نے انہیں بری طرح مایوس کیا تھا۔

''مراد بھائی! سوری لیکن میں آپ کی کال ریسیو نہیں کر سکتی تھی' سارہ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا اور آپ تو اسے جانتے ہی ہیں۔''ان کے ہیلو کے جواب میں اس کی مدھم سی آواز آئی تھی۔اور ان سے زیادہ بھلا سارہ شاہ کو کون جانتا تھا' ایک تلخ سی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا تھا۔

''صبح سے میں سوچ رہی تھی کہ کیا کروں.....آپ کو فون کروں یا نہ کروں لیکن اب رہا نہیں گیا.....''وہ ایک دم چپ ہو گئی تھی۔

''خیریت تو ہے نا ثمین بھابی!''وہ ایک دم پریشان ہوئے۔

''وہ کل امان کو پاکستان بھجوا رہی ہے۔''

''اوہ' تو آپ لوگ واپس چلے گئے تھے اسی دن؟''چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''ہاں' سارہ کی ضد تھی۔''ثمین نے کہا اور مراد شاہ سے کتنی دیر کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔

''مراد بھائی! بچے بہت حساس ہوتے ہیں.....امان کے لیے سارہ کے بغیر پاکستان آنا اور فضا کو ماں کے روپ میں قبول کرنا آسان نہیں ہوگا۔یہ صورتحال اس کو ذہنی طور پر پریشان کر سکتی ہے لیکن سارہ ہے کہ کچھ بھی سننے کو تیار ہی نہیں' بس ایک ہی رٹ ہے کہ امان کو پاکستان بھجوا دیں' جب اس کے باپ سے میرا کوئی تعلق نہیں تو اس سے بھی نہیں' بہت سمجھایا ہے میں نے اور بہروز نے لیکن وہ نہیں مانی' مجبوراً ہم لوگ ایک دو دن میں امان کو بھیج رہے ہیں آپ کچھ کر سکتے ہیں تو کوشش کر دیکھیں کہ وہ امان کو فی الحال یہیں رہنے دے۔''

''میں کیا کروں بھابی! اس دن سے اسے اور آپ کی پوری فیملی کو فون کر کر کے تھک چکا ہوں۔بے شمار میسجز کیے ہیں سارہ کے موبائل پر مگر کوئی جواب نہیں دیا اس نے' کیا کروں آخر میں؟''انہوں نے بے بسی و ناراضی سے کہا۔

ثمین بھلا کیا کہتی' ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے مراد بھائی' یونہی خیال آیا تھا کہ آپ کو پہلے سے بتا دوں تا کہ آپ اس معاملے کو بہتر طور سے ہینڈل کر سکیں۔امان کے بارے میں کتنی حساس تھی وہ مگر اب تو یوں لگتا ہے کہ اس واقعہ نے جیسے اسے ہر احساس سے عاری کر دیا ہے لیکن آپ تو سمجھ سکتے ہیں نا مراد بھائی کہ امان کے لیے یہ قطعاً بہتر نہیں ہوگا۔ایک دن تو وہ سارہ کے بغیر

رہتا نہیں ہے۔او کے مراد بھائی! لگتا ہے سارہ اٹھ گئی ہے اللہ حافظ۔''

فون بند ہو گیا تھا اور وہ گم صم سے کھڑے تھے۔

''کیا بات ہے شاہ جی.....! آپ پریشان نظر آ رہے ہیں۔سب خیریت تو ہے نا! کس کا فون تھا؟'' فضا جو انہیں موبائل فون پر بات کرتے دیکھ کر لان میں چلی آئی تھی' انہیں یوں گہری سوچ میں ڈوبے پریشان دیکھ کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے قریب آئی۔

وہ چند لمحے الجھی الجھی نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے تھے پھر اسے لیے لان کی کرسیوں پر آ بیٹھے تھے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سارا مسئلہ اسے بتا دیا تھا۔

وہ سنجیدگی سے انہیں دیکھتی ساری بات سنتی رہی تھی پھر آہستگی سے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''میرا خیال ہے شاہ جی کہ آپ کو فوراً امریکا جانا چاہیے اور سارہ باجی سے مل کر انہیں منانے کی کوشش کرنی چاہیے۔اب کچھ دن گزر گئے ہیں آپ ان سے مل کر پیار محبت سے سمجھانے کی کوشش کریں گے تو وہ ضرور آپ کی بات سمجھ جائیں گی۔دیکھا جائے تو ان کا رویہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔دیکھیے نا! غصے اور رنج میں انسان کا یہی ردعمل ہوتا ہے۔'' اپنے دھیمے اور شیریں لہجے میں وہ انہیں اس عورت کے بارے میں دلائل دے رہی تھی جو اسے اپنے اجڑنے کا واحد سبب گردانتے ہوئے گالیوں اور گھونسوں کے ساتھ اس پر پل پڑی تھی۔کیسی انہونی بات تھی نا!

انہوں نے بغور اسے دیکھا تھا۔وہ انہیں کسی اور ہی دنیا کی باسی دکھائی دے رہی تھی۔کسی قسم کی ناگواری' جلن' حسد کا نام و نشان نہیں تھا۔

''دراصل وہ آپ سے بے حد محبت کرتی ہیں' اس لیے یہ سب برداشت نہیں کر پا رہیں۔'' انہیں خاموش دیکھ کر اس نے مزید کہا تھا۔

''ہونہہ! بے حد محبت' کاش وہ تھوڑی سی ہی محبت کرتی۔'' انہوں نے تلخی سے سوچا تھا۔اس کے نروس بریک ڈاؤن اور پھر ہوش میں آنے پر اس کی بہتی آنکھوں کو دیکھ کر انہوں نے بھی سوچا تھا کہ شاید وہ واقعی ان سے اتنی محبت کرتی تھی کہ ایک دوسری عورت کو ان کی زندگی میں برداشت نہیں کر پائی تھی' لیکن پھر وہ اپنے اس خیال کو بدلنے پر مجبور ہو گئے تھے اور اب تو انہیں اپنی اس خوش فہمی پر ہنسی آتی تھی اور اپنی بے وقوفی پر غصہ آتا تھا کہ برسوں سارہ شاہ کے ساتھ گزارنے کے باوجود بھی وہ اس کے بارے میں اس قدر خوش گمان ہو گئے تھے۔حالانکہ اب تو انہیں جان لینا چاہیے تھا کہ سارہ شاہ جیسی عورتیں صرف اپنے آپ سے محبت کرتی ہیں' اپنے دلکش سراپا سے' اپنے حسین چہرے سے' یا پھر اپنی انا سے' انا مجروح ہو' انہیں نظر انداز کیا جائے' ان پر کسی اور کو فوقیت دی جائے تو ان کی برداشت سارہ شاہ ہی کی طرح جواب دے جاتی ہے۔یہ پہلی بار تھا کہ وہ سارہ کے بارے میں شدید ناگواری اور تلخی سے سوچ رہے تھے اور جوں جوں سوچ رہے تھے ان کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔یہ لڑکی جو ان کے سامنے بیٹھی تھی' نہ تو سارہ شاہ کی طرح حسن و جمال میں بے مثال تھی' نہ پہننے اوڑھنے میں باکمال تھی' جس کی علمی استعداد اور خاندانی پس منظر کچھ بھی نہیں تھا لیکن اس کا ظرف بلاشبہ حیران کر دینے والا تھا' وہ دل میں اترنے کا ہنر جانتی تھی' غم گساری کا' دلداری کا فن جانتی تھی۔انہوں نے بے حد محبت اور عقیدت سے اسے دیکھا تھا۔وہ اپنی نرم اور دھیمی آواز میں انہیں عورت کے احساسات اس کے جذبات کے بارے میں بتاتے ہوئے بڑی عمدگی کے ساتھ سارہ شاہ کی وکالت کر رہی تھی۔اس عورت کی وکالت جو اس کا نام تک سننے کی روادار نہیں تھی۔ جو اس کے وجود کو کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔جو اسے نہایت حقارت سے بھکارن کہتے ہوئے پیٹنے لگی تھی۔مراد شاہ کے دل میں فضا کی محبت دوچند ہو گئی تھی۔

.....☆☆☆.....

سارہ شاہ نے اپنی دکھتی آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے سونے کی کوشش کی تھی' چت لیٹے لیٹے تھکی تو تکیے میں منہ دے لیا تھا۔کروٹیں بدلتے بدلتے اس کا جسم دکھنے لگا تھا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔اسے لگتا تھا جیسے وہ صدیوں اور قرنوں سے سوئی نہیں تھی۔آنکھیں جو رتجگوں کی عادی نہیں تھیں' چند دنوں میں ہی ویران صحراؤں کے مانند نظر آنے لگی تھیں۔ایک گہری اور پرسکون نیند کے لیے وہ ترس کر رہ گئی تھی۔نیند کی گولیوں سے نیند آتی بھی تو جیسے لاکھ منت سماجت کے بعد اور بیدار ہونے کے بعد دل و ذہن اور جسم ویسے ہی تھکن سے نڈھال ہوتے۔ایک عجیب سی توڑ پھوڑ ہر وقت اس کے وجود کو بے کل کیے رکھتی تھی۔

ثمین سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی اس کو سمجھانے کی بہلانے کی سعی کرتی رہتی بہروز بھی شام کو خاص طور پر اس کے لیے وقت نکالتا۔ بڑے دونوں بھائی بھابیاں اور بھتیجے بھتیجیاں بھی آتے جاتے رہتے گھر میں ہر وقت چہل پہل رہتی مگر اس کے اندر گہرا سناٹا بھائیں بھائیں کرتا اسے ڈراتا خوفزدہ کرتا۔ ذرا سی اکیلی ہوتی آنکھیں موندتی تو مراد شاہ کی نفرت میں ڈوبی نگاہیں اس کی سانسیں بند کرنے لگتیں پسینہ پسینہ کر دیتیں سر درد سے پھٹنے لگتا دل کو جیسے کوئی آکٹوپس جکڑنے لگتا وہ نگاہیں جب محبت کی مدھ برسایا کرتی تھیں تو اسے ان میں کوئی انوکھا پن کوئی نیا پن محسوس نہیں ہوتا تھا شاید اس لیے کہ محبت کی اس کی زندگی میں اس قدر فراوانی رہی تھی کہ تعریف اور ستائش کی طرح محبت بھی اسے اپنا حق لگنے لگی تھی۔ یہ خیال اسے کبھی آیا ہی نہیں کہ جو لوگ ہم سے محبت کرتے ہیں جواب میں محبت پانے کے وہ بھی اتنے ہی حقدار ہوتے ہیں جتنا کہ وہ خود کو سمجھتی تھی اور یہ خیال اسے تب آیا تھا جب نہ کوئی فرض رہا تھا اور نہ کوئی حق۔

دکھتی آنکھوں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے سارہ شاہ نے آنسوؤں کا اک گولا حلق میں پھنستا محسوس کیا تھا۔

"یقیناً وہ محبت کی حقدار نہیں تھی۔" کھلے دل سے اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اذیت کا اک گہرا احساس اس کے رگ و پے میں سما گیا۔ محبت کو اس نے ہمیشہ انمول خزانہ نہیں بلکہ نذرانہ سمجھ کر وصول کیا تھا۔ اس لیے یقیناً وہ محبت کی حقدار نہیں تھی..... مگر نفرت..... اس کا دل چاہا تھا وہ دہاڑیں مار مار کر روئے اتنا کہ دل کی بنجر زمین سیراب ہو جائے۔ آنکھوں میں مسلسل چبھتی ریت ان آنسوؤں میں بہہ جائے مگر سونے کی طرح رونا بھی شاید سارہ شاہ کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

سارہ شاہ اور اس قدر بے اختیار..... کس قدر حیران کن بات تھی یہ اور حیران کن تو اور بھی بہت کچھ تھا جس کے بارے میں اس نے کبھی لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں سوچا تھا۔ سوچنا تو دور کی بات تھی ان کی تو اس سے آشنائی تک نہ تھی۔ وہ کیفیات کیسے اس کی زندگی کا حصہ بن گئی تھیں۔ اداسی پژمردگی رنج دکھ تنہائی اتنے سارے رشتوں اور محبتوں کی موجودگی میں بھی تنہائی..... یہ سب کیا تھا.....؟ وہ حیران ہو ہو کر سوچتی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اور کبھی جو بات دنوں ہفتوں اور مہینوں سمجھ میں نہیں آتی وہ صرف ایک لمحہ صرف ایک پل پوری جزئیات کے ساتھ سمجھا دیتا ہے اس وقت انسان کے سامنے جیسے کوئی فلم سی چلنے لگتی ہے جس میں اس کے دل کش خدوخال کے ساتھ ساتھ اس کے اعمال بھی نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ خود کو "یوں" اپنے "روبرو" دیکھ کر وہ حیران رہ جاتا ہے پھر کبھی تو وہ فوراً ہی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور ہر منظر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے کبھی خدوخال پر ہی یوں نگاہیں مرکوز رہ جاتی ہیں کہ اعمال نظر ہی نہیں آتے اور کبھی وہ مان لیتا ہے کہ ہاں یہ وہ ہی ہے۔ وقتی طور پر یہ مشکل ہوتا ہے ندامت بھی ہوتی ہے شرمساری بھی لیکن اس کے بعد یہ مان لینا بڑے دور رس نتائج لاتا ہے۔

اس وقت سارہ شاہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

جب سونے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تو وہ کسلمندی سے اٹھی اور واش روم کا رخ کیا کافی دیر شاور لینے کے بعد طبیعت پر چھائی مردنی اور پژمردگی کچھ کم ہوئی تھی لان کا سوٹ جس پر اس نے بڑے شوق سے ڈیزائننگ کی تھی بے دلی سے پہنتی بالوں میں بے پروائی سے برش کرتی وہ بیڈ روم سے نکل آئی تھی۔

"امان....." لاؤنج میں صوفے پر گھٹنوں میں سر دیے امان کو دیکھ کر وہ تیر کی طرح آگے بڑھی تھی۔

"امان! تم ٹھیک تو ہو میرے بچے!" بے چینی سے اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"یس مما!"

"تو ایسے کیوں بیٹھے ہو بیٹا! آپ تو امروز کے ساتھ گیم کھیل رہے تھے نا اور آپ کہہ رہے تھے آج آپ اسی کے ساتھ سوؤ گے بھی۔" پریشانی سے وہ ایک ہی سانس میں پوچھ گئی۔

"نیند نہیں آ رہی تھی مما!"

"تو آپ میرے پاس کیوں نہیں آئے؟"

''آیا تھا نا مما! آپ سو رہی تھیں۔ مما آپ کو پتا ہے انکل کی طبیعت بہت خراب ہے۔'' ایک دم وہ فکرمند لہجے میں بولا تھا۔

''بہروز بھائی کی.....؟ آپ کو کس نے بتایا؟''

''آنٹی کہہ رہی تھیں آپ کے انکل کی طبیعت خراب ہے آپ کچھ دیر بیٹھو ابھی ٹینا آتی ہے تو آپ کو کھانا دیتی ہے۔ مما انکل کے بہت زیادہ درد ہے کیا؟''

''اوہ'' پریشانی سے اس کے منہ سے نکلا اور وہ تیزی سے بہروز بھائی کے کمرے کی طرف بڑھی۔

''آجاؤ سارہ۔'' سارہ کی آواز پر ثمین نے دروازہ کھولا۔ پھر بہروز کی پائنتی کے پاس بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگی۔

''کیا ہوا بھائی..... امان بتا رہا ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟'' اس نے فکرمندی سے بھائی کو دیکھا۔

''تین چار دن سے اس قدر بخار ہے' کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں آرام کر لیں مگر سنتے ہی نہیں۔'' ثمین نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں بھائی! کیوں کر رہے ہیں آپ ایسا؟'' اس نے قریب آ کر بھائی کی پیشانی کو چھوا۔

''سارہ! کچھ بھی نہیں ہوا ہے مجھے' ذرا سا ٹمپریچر ہے۔ مگر یہ جو تمہاری بھابی اور دوست ہے نا! ایک دم پاگل ہے۔ یوں میرا خیال رکھ رہی ہے جیسے خدانخواستہ جانے کیا ہو گیا ہے مجھے۔ میں سو رہا ہوتا ہوں یہ مجھے دباتی رہتی ہے۔ ہے نا پاگل۔'' وہ بے حد پیار بھری نظروں سے ثمین کو دیکھتے کہہ رہے تھے۔ اور سارہ شاہ ایک ٹک بہروز کی پنڈلیاں دباتی ثمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک دھیمی اور گمبھیر آواز کی گونج اسے بہت نیچے کسی گہرے پاتال میں لیے جا رہی تھی۔

.....☆☆☆.....

''اف!'' مراد شاہ اضطراری حالت میں سر کو تکیے پر ادھر سے ادھر پٹختے ہوئے کراہ رہے تھے۔ سارہ نے ان کی کراہ پر ایک ثانیے کو پلٹ کر انہیں دیکھا تھا۔ باہر نکل کر خانساماں کو چائے اور سر درد کی ٹیبلٹ لانے کے لیے کہا اور پھر واپس آ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ آج لگی کی منگنی تھی۔ عزیز و اقارب کے علاوہ شوبز کے بہت سے لوگ آ رہے تھے۔ کئی ماڈلز اور فلم اسٹارز بھی تھیں۔ لگی نے خاص طور پر اس سے فرمائش کی تھی کہ آج اسے خوب اچھی طرح تیار ہو کر آنا ہے۔

''بس ہر طرف لگی کی بیسٹ فرینڈ ہی کا تذکرہ ہونا چاہیے۔''

''اور لگی خود.....'' سارہ ہنسی تھی۔

''لگی کے علاوہ.....'' اس نے کھنکتی ہنسی کے دوران کہا تھا۔ آج کل وہ بے حد خوش تھی اور یہ خوشی اس کی ہر ادا سے ظاہر تھی۔

''سارہ! یار بہت درد ہے' ذرا سر دبا دو پلیز۔'' مراد شاہ اس کی تمام تیاریوں سے بے خبر نیم غنودگی میں کہہ رہے تھے۔ وہ پہلے ہی نوشین کے کراچی چلے جانے پر سخت جھنجلائی ہوئی تھی۔ عادت بھی تو ایسی ہو گئی تھی اس سے میک اپ کروانے کی کہ کسی اور بیوٹیشن کے بارے میں سوچنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔

''سارہ.....'' مراد شاہ نے اپنی بند آنکھیں بمشکل کھولنے کی سعی کرتے ہوئے بے چینی سے پکارا تھا۔ اس نے پلٹ کر ان کی جانب دیکھا اور ان کے سرخ چہرے اور مندی مندی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے فکرمند سی ہو کر ان کی جانب بڑھی تھی۔ تبھی اس کے فون کی گھنٹی بجی تو موبائل فون اٹھاتے ہوئے اس نے نمبر دیکھا تھا۔ لگی کا فون تھا وہ بری طرح جھنجلائی تھی۔ ''اب کیا کروں.....؟'' ایک نظر مراد شاہ کی طرف اور دوسری وال کلاک پر ڈالتے ہوئے وہ الجھی ہوئی تھی۔ فنکشن چھوڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن مراد شاہ کا بخار بھی مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ انہیں اس حالت میں چھوڑ کر جانے کو بھی دل نہیں مان رہا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے جلدی سے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا تھا اور خود اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دینے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر راحیل آ پہنچے تھے۔

تب تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا مگر اب سارہ شاہ کو یاد آ رہا تھا کہ مراد شاہ کو چیک کرنے کے بعد اسے دیکھتے ہوئے وہ کس قدر حیران اور متاسف تھے۔ ان کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یقیناً یونہی حیران و متاسف ہوتا۔ شوہر یوں بے سدھ پڑا ہو اور بیوی سج سنور کر فنکشن میں شمولیت کے لیے بیتاب ہو تو اس پر سوائے افسوس کے اور کیا بھی کیا جا سکتا

ہے۔اور صرف ایک یہی نہیں ایسے اور بھی بہت سے لمحے تھے جو اسے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے تھے اور بار ندامت سے اس کے سر کو جھکانے لگے تھے۔

شرمساری' ندامت' نہیں یہ بہت چھوٹے لفظ تھے اس وقت سارہ شاہ کی جو کیفیت تھی اس کی عکاسی شاید ان لفظوں سے نہیں ہو سکتی تھی۔گزرے ماہ و سال میں اس نے جب بھی اپنے خوب صورت ترین چہرے اور سراپا کو دیکھا تھا تو ہمیشہ اپنے اس بے تحاشا حسن کو سراہا تھا' اسے امر کرنا چاہا تھا مگر اب پہلی بار اپنے بدصورت ترین رویوں کو دیکھ رہی تھی تو مر جانا چاہتی تھی اور مرتو شاید وہ چکی ہی تھی۔کسی بہت اپنے' چاہنے والے شخص کے دل سے اتر جانا مر جانے کے مترادف ہی تو ہے۔

''کیا ہوا سارہ.....تم ٹھیک ہو؟''ثمین نے فکرمندی سے اسے دیکھا مگر وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھی تیزی سے پلٹی اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

''اسے کیا ہوا؟''بہروز ہاشمی نے پریشانی سے اٹھنا چاہا تھا مگر ثمین نے دھیرے سے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اٹھنے سے روک دیا۔

''شاید کسی یاد نے دل میں ہلچل مچائی ہوگی اسے کچھ دیر تنہا رہنے دیں' سوچنے دیں' رونا چاہے تو کھل کر رونے دیں' اسے فیصلہ کرنے دیں کہ اسے آئندہ کیا کرنا ہے۔ہر وقت اس کے ساتھ لگے رہنا خود اس کے لیے سودمند نہیں ہے۔''بیوی کی اس بات سے متفق ہوتے ہوئے بہروز نے ایک گہری سانس لی اور سر واپس تکیے پر رکھ دیا۔

بے شمار دنوں کے بعد اس دن سارہ شاہ کھل کر روئی تھی۔اس قدر ٹوٹ کر جیسے آج کے بعد دوبارہ کبھی نہیں روئے گی۔روتے روتے اس کی آواز بیٹھ گئی اور آنکھیں سوج گئی تھیں۔آخر کار وہ بے دم ہو کر آڑھی ترچھی بستر پر گر گئی تھی۔اور عین اسی وقت مراد شاہ نے بہروز ہاشمی کے گھر میں قدم رکھا تھا۔

امان' مراد شاہ کی آواز سن کر بھاگ کر آیا تھا اور ان کے ساتھ لپٹ گیا۔

''شکریہ پاپا! آپ آ گئے۔میں آپ کو بہت یاد کر رہا تھا۔''

''کمال ہے یار! آپ اپنی مما کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی مجھے یاد کر رہے تھے؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔یقینا کوئی فرمائش پوری کروانے کے لیے پپا سے سفارش کروانی ہے۔''وہ اسے اٹھائے ہوئے خوشدلی سے مسکرائے۔

''آپ کو پتا ہے مما ٹھیک نہیں ہیں۔وہ زیادہ تر کمرے میں ہی رہتی ہیں اور آج تو میں بہت دیر تک دروازہ بجاتا رہا.....اتنی آوازیں بھی دیں.....وہ بولی تک نہیں آپ کو پتا نہیں پپا مجھے کتنا رونا آیا؟ بہت زیادہ.....تب آنٹی نے مجھے کہا کہ اچھے بچے روتے نہیں ہیں' میں اچھا بچہ ہوں نا پپا! میں روتو نہیں رہا۔مگر پاپا مما کو دروازہ تو کھولنا چاہیے تھا نا!''قدرے ناراض اور فکرمندی سے کہتا وہ انہیں اپنی عمر سے بہت بڑا لگا۔انہوں نے اس کے پھولے پھولے رخساروں پر پیار کیا اور اسے اٹھائے اٹھائے اندر کی جانب بڑھے اور تبھی انہیں محسوس ہوا تھا کہ وہ خاصا کمزور ہو چکا تھا۔

''کتنی عجیب عورت ہو تم سارہ شاہ! کس قدر عجیب سوائے اپنے آپ کے تمہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ساری زندگی تمہاری بے حسی اور خود پرستی نے مجھے اذیت دی اور اب یہی اذیت تم میرے بیٹے کو دینا چاہتی ہو' مگر اب میں خاموش نہیں رہوں گا۔بہت فائدہ اٹھا لیا تم نے میری خاموشی کا مگر اب اور نہیں۔''امان کے چہرے پر نگاہ جمائے انہوں نے انتہائی تلخی سے سوچا تھا۔ثمین نے ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن پھر آرام سے بات کرنے کا سوچ کر مراد شاہ کو بیٹھنے کا کہتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔مراد شاہ نے چند لمحے امان کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے کچھ سوچا پھر اسے امروز کے ساتھ کھیلنے کا کہہ کر سارہ شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔وہ اس وقت شدید بدگمانی کا شکار تھے اور بدگمان انسان جو کچھ سوچ رہا ہوتا ہے وہی اسے ٹھیک نظر آتا ہے جو کچھ کر رہا ہوتا ہے وہ اس کے لیے خود کو سو فیصد درست سمجھتا ہے۔مراد شاہ بھی ایسا ہی سمجھ رہے تھے۔اس وقت انہیں یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ہو سکتا ہے واقعی وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے امان کو توجہ نہ دے پا رہی ہو یا اس کی خرابی صحت کی وجہ سے امان بھی پریشان ہو اور کمزور ہو رہا ہو۔تیزی سے دروازہ بجاتے ہوئے انہوں نے خاصی بلند آواز میں اسے پکارا تھا لیکن اگلے ہی لمحے انہیں احساس ہوا تھا کہ اس وقت وہ اپنے گھر میں نہیں تھے۔ان کی آواز خود بخود ہی دھیمی ہو گئی تھی۔

ان کی پکار جیسے خواب کے عالم میں سارہ شاہ کے سوتے جاگتے ذہن سے ٹکرائی تھی اور اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔وہ انتہائی بیتابی سے اٹھ کر دروازے کی

جانب بڑھی تھی اور پھر جیسے زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔ بکھرے ہوئے بال..... سرخ بے حد متورم آنکھیں..... کچھ دیر وہ گومگوں کی کیفیت میں کھڑی رہی تھی مراد شاہ مسلسل دروازہ بجاتے ہوئے پکارے جا رہے تھے۔ وہ منہ پر چھینٹے مارنے کے خیال سے واش روم کی طرف بڑھنے کو تھی جب مراد شاہ کی بھنچی بھنچی آواز اور زہر میں ڈوبے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے اور اس کے اٹھتے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔

وہ اپنی ساری غلطیاں مان چکی تھی۔ ساری خطائیں تسلیم کر چکی تھی۔ اس نے آج تک مراد شاہ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ جیسے جیسے ان کی محبتوں کو ان کے جذبوں کو نظر انداز کیا تھا' اس کے لیے وہ خود کو معافی کے قابل بھی نہیں سمجھتی تھی۔ مگر یہ تو وہ ایسی فرد جرم عائد کر رہے تھے اس پر.....؟ سائیں سائیں کرتے کانوں کے ساتھ بے یقینی سے دروازے کو گھورتی ہوئی وہ گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

وہ چیخ چیخ کر ان الزامات کی نفی کرنا چاہتی تھی مگر زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے اور دل جیسے پھٹنے کو تھا۔

"کیا امان سے اس کی محبت پر بھی شک کیا جا سکتا تھا!"

اس نے اپنے گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے جیسے خود سے پوچھا تھا۔ ہاں' کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے امان کو جنم نہیں دیا تھا۔ وہ امان کی ماں نہیں تھی

"امان کی ماں.....!" اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے اور دل جیسے شدت غم سے پھٹنے کو تھا۔ وہ اٹھی تھی اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھی۔

ثمین جس وقت مراد شاہ کے لیے اسٹرابری شیک تیار کر کے لائی' مراد شاہ بے حد تیز قدموں سے باہر نکلتے دکھائی دیے۔ وہ حیران و پریشان سی سارہ کے کمرے کی جانب آئی تھی اور عین اسی لمحے سارہ نے زار و قطار روتے اور چلاتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔

"ہاں..... میں ایک خود غرض عورت ہوں۔ خود پرست ہوں' دوسروں کو اذیت دیتی ہوں۔ مگر..... امان..... میں اس کو کیسے..... میرا بیٹا ہے وہ' میری..... میری جان ہے اس میں..... میں اس کو....." بکھرے بالوں اور سوجی ہوئی آنکھوں کو جیسے بمشکل کھولے' روتے سسکتے ہوئے غریا دکناں لہجے میں کہتی ہوئی سارہ شاہ کو دیکھ کر ثمین کا دل جیسے پانی ہونے لگا تھا۔ ہاتھ میں تھامی ٹرے وہیں پاس ہی ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھی اور سارہ شاہ کے لرزتے وجود کو تھام لیا۔

"سارہ پلیز..... اپنے آپ کو سنبھالو..... دیکھو کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟ امان تمہیں اس طرح دیکھے گا تو کس قدر ڈسٹرب ہو گا۔" بے حد نرم اور پیار بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اسے ساتھ لیے کمرے میں آئی اور بیڈ پر بٹھا دیا۔

"ثمین! تم میری دوست ہو نا..... تم تو مجھے جانتی ہو نا!" وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں سارہ کیا تمہیں کوئی شک ہے۔ میری دوستی اور محبت میں کوئی کمی محسوس کی ہے تم نے.....؟" ثمین جانتی تھی کہ اس وقت اسے محبت اور غمگساری کی ضرورت ہے۔ اس لیے بے حد ملائمت سے اس کے گیلے رخساروں کو صاف کرتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"وہ مراد شاہ وہ کہتے ہیں میں امان کو نظر انداز کر رہی ہوں میں اس کا خیال نہیں رکھتی' اس لیے کہ وہ میرا نہیں کسی اور کا بیٹا ہے اور میرے جیسی خود پرست عورت اپنے علاوہ کسی اور سے محبت نہیں کر سکتی۔ تم بتاؤ ثمین! کیا میں امان سے محبت نہیں کرتی؟" اس کے لہجے میں عجیب سی بے تابی تھی۔ ثمین نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے اس کی کمر کو سہلایا۔

"مراد بھائی شاید اس وقت غصے میں ایسا کہہ گئے ہوں گے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں سارہ! وہ کیا جانتے نہیں کہ امان میں تو تمہاری جان ہے؟"

"نہیں ثمین! وہ نہیں جانتے وہ بالکل بھی نہیں جانتے وہ..... وہ اسے مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں..... لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" اس کی آواز میں ایکدم ہی چٹانوں کی سی سختی در آئی تھی۔

"مگر سارہ! تم خود ہی تو امان کو پاکستان بھجوانے کا کہہ رہی تھیں۔" ثمین نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ہاں میں سمجھتی تھی میں اس کے بغیر رہ لوں گی..... مگر نہیں رہ سکتی' میں نہیں رہ سکتی ثمین..... اور وہ بھکارن' چڑیل مجھ سے امان کو بھی چھین لے گی۔ میں..... میں اسے زندہ

نہیں چھوڑوں گی اگر اس نے امان کی طرف دیکھا بھی تو......" اس کی سانس پھول گئی تھی اور آنسوؤں نے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔

"ٹھیک ہے سارہ! مت بھیجنا تم امان کو...... بس تم اپنا خیال رکھو تم خود ٹھیک رہو گی تو امان کا بھی خیال رکھ سکو گی نا! اب جلدی سے فریش ہو کر آؤ' میں تمہارے لیے شیک لے کر آتی ہوں پھر دونوں بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے بڑے دنوں سے تمہارے ساتھ محفل نہیں جمی یار!" ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے ثمین نے اسے اٹھایا اور واش روم کی طرف بھیجتے ہوئے خود باہر نکل گئی بڑے میز سے اٹھاتے ہوئے اسے اپنے فون کی بیپ سنائی دی۔

"جی مراد بھائی! کہاں ہیں آپ؟ میں آپ کے لیے اسٹرابری شیک لے کر آئی تو آپ غائب تھے۔" ثمین نے یہ ظاہر کیے بنا کہ وہ انہیں غصے کی حالت میں جاتے دیکھ چکی تھی ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"آپ کے ہاں سے جو عزت افزائی ہوئی' وہی کافی تھی اس لیے مزید ٹھہرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی پھر کچھ ضروری کام بھی نمٹانے تھے۔ خیر' آپ ایسا کیجیے گا کہ امان کا ضروری سامان پیک کروا دیجیے گا۔ میں اسے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مراد بھائی! سارہ......" ثمین نے حیران و پریشان ہوتے ہوئے کہنا چاہا تھا مگر انہوں نے درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ دی۔

"میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں بھابی! آپ امان کو تیار کروا کر اس کا پاسپورٹ بھی نکلوا دیجیے گا۔ میں دو تین گھنٹے تک اسے پک کر لوں گا۔" اپنی بات ختم کرتے ہی انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ ثمین سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی تھی۔

"اب وہ کیا کرے...... کیسے سارہ سے بات کرے...... نہیں' سارہ سے یہ بات نہیں کی جا سکتی...... مگر......" شدید الجھن اور پریشانی میں ثمین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس نے مراد شاہ سے ہی بات کرنے کی ٹھانی اور اٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے ان کا نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی مگر انہوں نے فون ریسیو نہیں کیا تھا۔ ایک بار...... دوبار بیل گئی تھی اور پھر لائن کاٹ دی گئی تھی۔ ثمین چند لمحے خالی خالی نگاہوں سے موبائل کو دیکھتی رہی پھر بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے بہروز کو ساری صورت حال بتانی چاہیے۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ فوراً بہروز کا نمبر ملانے لگی۔ تبھی باہر سے سارہ کی آواز آئی تھی اور وہ تیزی سے موبائل فون رکھ کر باہر نکلی تھی۔ پھر ٹھٹک کر وہیں دہلیز پر رک گئی تھی۔ سارہ بے تابی کے ساتھ امان کو بھینچ بھینچ کر پیار کر رہی تھی۔ ثمین کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"جانے کس کی نظر لگ گئی تھی اس کی پیاری سی نند کی خوشیوں بھری زندگی کو......" ثمین نے دکھی دل کے ساتھ اس کی متورم آنکھوں اور بے رونق چہرے کو دیکھتے ہوئے تاسف سے سوچا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ اسے بے حد عزیز تھی۔ نند بھاوج والا رشتہ تو ان کے درمیان جیسے کوئی تھا ہی نہیں۔

وہ مونٹیسوری سے کلاس فیلوز اور دوست تھیں پھر بہروز ہاشمی سے محبت اور پھر شادی کے بعد یہ دوستی اور پختہ ہو گئی تھی کیونکہ یہ سارہ شاہ ہی تھی جس نے اس کی راہیں ہموار کی تھیں ورنہ بہروز تو نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی ماریہ کی زلفوں کا اسیر ہو چکا تھا لیکن سارہ نے وعدہ کیا تھا کہ اسے چاہے جو بھی کرنا پڑے لیکن یہ طے ہے کہ وہ بہروز کو اس انگریز حسینہ کے چنگل سے چھڑا کر رہے گی اور اس کی بھابی صرف ثمین ہی بنے گی۔ اور اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا اور ہمیشہ ہی اس نے جو چاہا تھا پا لیا تھا' مگر اب زندگی کے اس موڑ پر وہ کتنی شکستہ اور بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ ثمین کا دل کٹنے لگا وہ آہستگی سے واپس مڑی اور موبائل فون اٹھا کر واش روم میں جا کر بہروز کو کال کرنے لگی وہ جلد از جلد بہروز کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہتی تھی۔

......☆☆☆......

"السّلام علیکم شاہ جی! کیسے ہیں آپ...... سارہ باجی مان گئیں نا؟ مجھے یقین تھا اب ان کا غصہ ختم ہو گیا ہو گا وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہیں اور میں جانتی تھی کہ وہ ضرور مان جائیں گی کیونکہ محبت میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔" مراد شاہ کی کال ریسیو کرتے ہی وہ پرجوش لہجے میں کہتی چلی گئی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوا فضا' وہ فضا نہیں' سارہ ہے جسے اپنے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا خیر میں امان کو ساتھ لے کر آ رہا ہوں ابھی کچھ دیر میں ڈرائیور امان کو آیا کو تمہارے پاس لے

آئے گا۔تم اس کی مدد سے امان کے لیے کمرا تیار کرلینا۔''انہوں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے اسے جیسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔فضا ان کی بات سن کر پہلے تو ہکا بکا رہ گئی تھی لیکن جلد ہی اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا۔

''شاہ جی خدارا! یہ جذبات میں آنے کا وقت نہیں ہے۔اس الجھے ہوئے معاملے کو انتہائی تحمل اور برداشت کے ساتھ سلجھانے کی ضرورت ہے'آپ خدارا کچھ بتائیں تو سہی کہ آخر ہوا کیا ہے؟'' بے حد دھیمے اور ملائم لہجے میں اس نے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا تھا اور حیرت انگیز طور پر انہوں نے خود کو پرسکون محسوس کیا تھا۔پھر انہوں نے ساری بات اسے بتادی تھی اور وہ بجائے امان کے لیے فکرمند ہونے کے سارہ کے لیے فکرمند ہوگئی تھی اور مراد شاہ حیران رہ گئے تھے۔سارہ کی ذہنی کیفیت اور جذبات پر بات کرتی'اس کی حمایت میں دلیلیں دیتی اس لڑکی کے ظرف اور بڑائی نے انہیں جیسے کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا لیکن اس کی ساری باتوں اور دلیلوں کے باوجود وہ خود کو دوبارہ سارہ کے پاس جانے کے لیے تیار نہیں کرپائے تھے۔ہاں انہوں نے اتنا کیا تھا کہ ثمین کو فون کرکے اپنے جانے اور امان کو سارہ کے پاس ہی چھوڑنے کے بارے میں بتادیا تھا۔

اس رات فضا کو نیند نہیں آئی تھی۔وہ ساری رات بے چینی سے پورے گھر میں چکراتی پھری تھی۔دل بے حد بے چین تھا'روح مضطرب تھی۔کتنے عرصے سے اس نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھا نہیں تھا۔وہ جسے اس نے اپنے خون سے سینچا تھا لیکن دل بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا اور کسی کو سونپ دیا تھا۔دل کیسے کیسے نہیں تڑپا تھا'روح نے کس کس طرح فریاد نہیں کی تھی لیکن اس نے دل و روح کی ایک نہیں چلنے دی تھی۔

اس نے گیلی آنکھوں سے اس کی تصویر کو دیکھا اور بے تابی سے چوما'پھر بے اختیار سینے سے بھینچ لیا تھا۔

''میرے بیٹے! میرے دل کے ٹکڑے! کبھی یہ مت سمجھنا کہ تیری ماں کو تجھ سے محبت نہیں تھی۔محبت بہت تھی میرے بیٹے! بے حد تھی اور بھلا کون ماں ہوگی ایسی جسے اپنی اولاد سے محبت نہیں ہوگی'لیکن تیری ماں کسی کی مقروض تھی اور یہ قرض اتارنا چاہتی تھی اس کے لیے خواہ دل کا خون کرنا پڑتا یا پھر ممتا کا۔'' عجیب سی بے قراری کے عالم میں زیر لب کہتے ہوئے اس نے تصویر واپس رکھ دی تھی اور وضو کرنے کے لیے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

.....☆☆☆.....

''فضا! تم میری بیوی ہو'میری ذات پر'میرے گھر پر جتنا حق سارہ کا ہے اسی قدر تمہارا ہے پھر آخر تم وہاں جانے سے گریزاں کیوں ہو؟'' اس دن مراد شاہ نے بے حد الجھ کر اس سے پوچھا تھا۔ایک ماہ ہونے کو تھا انہوں نے ایک ماہ کے لیے ہی یہ گھر لیا تھا۔پھر اپنا گھر نوکروں پر چھوڑ کر وہ خواہ مخواہ یہاں کرائے پر رہتے تو یہ پاگل پن ہی تھا پھر وہ کوئی معقول وجہ بتاتی تو شاید وہ خود کو مطمئن کرپاتے لیکن وہ تو جیسے خود بھی وجہ نہیں جانتی تھی۔کم از کم مراد شاہ کو تو یہی محسوس ہوا تھا۔اسی لیے آج وہ کچھ الجھ کر پوچھ بیٹھے تھے۔

''شاہ جی دراصل بات یہ ہے کہ سارہ باجی کی غیر موجودگی میں'میں وہاں جانا نہیں چاہتی۔وہ آجائیں'میرے وجود کو تسلیم کرلیں'اس گھر میں میرے لیے اپنی مرضی سے تھوڑی سی جگہ نکالیں'یہ میری شدید خواہش ہے'کیا آپ میری یہ خواہش پوری نہیں کریں گے؟'' اس کے دھیمے اور ملتجی لہجے پر وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔اب وہ اسے کیسے سمجھاتے کہ اس کی اس خواہش کا پورا ہونا تقریباً ناممکنات میں سے تھا۔

''بس آپ کچھ عرصہ انتظار کرلیں مجھے یقین ہے کہ سارہ باجی مان جائیں گی۔''انہیں خاموش دیکھ کر اس نے بے حد اطمینان اور یقین بھرے لہجے میں کہا تھا اور پھر جلدی سے اٹھی اور کچن کی جانب بڑھی۔

سیٹیاں بجاتی تند و تیز ہوا کا گرد آلود جھونکا اس کے شیشہ بند کرتے ہوئے بھی اندر گھس آیا تھا۔مراد شاہ نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

''تمہیں کیسے فوراً پتا چل گیا فضا کہ آندھی آرہی ہے؟'' وہ واقعی بے حد حیران تھے۔

''مجھے الہام ہوتے ہیں'جیسے چند لمحے قبل مجھے الہام ہورہا تھا کہ آپ مجھے پاگل سمجھ رہے ہیں'ہیں نا۔'دسترخوان کھول کر ڈائننگ ٹیبل کے برتنوں کو پھیلاتے ہوئے وہ ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔

''صرف الہام! پوری جادوگرنی ہو تم اسی لیے تو اتنے لمبے چوڑے آدمی کو یوں اسیر کیا ہے کہ تمہاری مرضی اور منشاء کے بغیر خود کو ہلنے تک کے قابل نہیں پاتا۔'' انہوں نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ انہیں اتنا جانتی تھی کہ ان کا اندر تک پڑھ لیتی تھی۔ انہیں خود پر رشک آیا اور اس پر پیار۔

''کیا یہ اسیری آپ کو پسند نہیں ہے؟'' اس نے ناز سے انہیں دیکھا۔

''پسند تو بہت چھوٹا لفظ ہے فضا! اب تو اس اسیری سے رہائی موت ہوگی۔'' وہ یکدم بے حد سنجیدہ ہو گئے۔

''اللہ نہ کرے شاہ جی! کیسی خوفناک باتیں کر رہے ہیں۔'' اس نے دہل کر کہا۔ مراد شاہ نے دیکھا اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہلتے لب بتا رہے تھے کہ وہ دل ہی دل میں مناجات تھی۔ انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

شوہر پر جان چھڑکنے والی' بن کہے اس کی ہر بات کو سمجھ لینے والی' گھر بنانے اور سجانے والی ایک مکمل گھریلو عورت! شاید ایسی ہی عورت ان کا خواب تھی۔ گاؤں سے شہر آ کر یونیورسٹی کی خوب صورت فیشن ایبل اور تیز طرار لڑکیوں کے درمیان رہتے رہتے وقتی طور پر وہ اس چکاچوند میں کھو گئے اور یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ان کے شانہ بہ شانہ اور اس معاشرے میں ان کے ساتھ چلنے والی ایک بے حد پڑھی لکھی اور خوب صورت لڑکی ان کا آئیڈیل ہے۔ مگر سارہ شاہ کے ساتھ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد ان کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ خود کو ہی سمجھنے میں غلطی کر بیٹھے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہ ان کی طبیعت میں رچ بس گیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اثر سے باہر نہیں آ سکتے تھے' یہ تو سارہ کے ساتھ ان کی محبت اور فطرت میں رچی بسی شرافت تھی کہ وہ اتنے سال خوش اسلوبی سے نباہ گئے تھے اور شاید ساری زندگی بھی گزار دیتے اگر وہ حادثہ فضا کو ان کی زندگی میں نہ لے آتا۔

ایک لمحے کو اپنی حالت کا تصور کر کے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے لیکن اگلے ہی پل مسکراہٹ ان کے لبوں پر مچل اٹھتی تھی۔ چمکتی نگاہوں سے انہوں نے فضا کی جانب دیکھا۔ تبھی اس کی نگاہ اٹھی اور انہیں یوں وارفتگی سے خود پر نگاہیں جمائے دیکھ کر وہ محجوب سی ہو کر مسکرا دی۔

''اتنی محویت کے ساتھ کیا دعا مانگی جا رہی تھی؟'' بے حد محبت بھری نگاہوں سے اس کے صبیح چہرے کو دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''دادی کہا کرتی تھیں آندھی کے وقت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کرام کے ساتھ مسجد کا رخ کرتے تھے۔ اس لیے ہمیں بھی آندھی آنے پر اللہ سے خیر و عافیت کی دعا کرنی چاہیے اور پھر آپ بھی تو آندھی سے زیادہ خوفناک باتیں کر رہے تھے۔''

''اچھا بابا! اب نہیں کرتا' دیکھو تمہاری دعا سے آندھی ختم ہو گئی ہے اور بارش ہونے لگی ہے۔'' دریچے سے ٹکراتی بارش کی بوندوں کی آواز پر انہوں نے خوشدلی سے کہا اور اٹھ کر ڈائننگ روم کے پردے سمیٹ دیئے۔

''میں نے ایک اور دعا بھی مانگی ہے شاہ جی! وہ پوری ہو گئی نا تو بس سمجھئے فضا کی ساری خواہشیں پوری ہو گئیں۔'' خوب صورت سی مسکراہٹ لبوں پر لیے وہ کہہ رہی تھی۔

''اچھا..... وہ کون سی دعا ہے بھئی؟'' انہوں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''وہ..... ابھی نہیں بتاؤں گی۔''

''اور اگر میں کہوں' بتانی پڑے گی.....'' انہوں نے مصنوعی تحکم کا مظاہرہ کیا۔

''تو میں بتا دوں گی۔'' اس نے اتنے آرام سے کہا تھا کہ بے اختیار مراد شاہ کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

''میں نے سارہ باجی کے لوٹ آنے کی دعا مانگی ہے شاہ جی! اور آپ دیکھیے گا یہ دعا ضرور پوری ہو گی ان شاء اللہ۔'' مراد شاہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اس کے چہرے پر یقین اور طمانیت دیکھ کر خاموش ہو رہے۔ ''کتنا اچھا لگے گا نا شاہ جی! جب ہم سب اکٹھے رہا کریں گے۔ آپ دیکھیے گا میں سارہ باجی کا بہت خیال رکھوں گی۔ بڑی خدمت کروں گی ان کی' اس قدر محبت دوں گی انہیں کہ وہ خود بخود مجھے بڑی بہنوں کی طرح چاہنے لگیں گی۔'' وہ پرجوش انداز میں کہہ رہی تھی۔

مرادشاہ جانتے تھے کہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہی ہے اور کھلی آنکھوں سے دیکھے خواب پورے نہیں ہوتے لیکن وہ اس خواب میں گم خوش تھی تو وہ اسے خوش ہی رہنے دینا چاہتے تھے۔اسی لیے وہ خاموش ہی رہے تھے۔

.....☆☆☆.....

''وہ کبھی نہیں چاہے گی لگی کہ میں واپس پلٹ آؤں۔یہ جو غریب اور مڈل کلاس لڑکیاں ہوتی ہیں نا بڑے طریقے ہوتے ہیں ان کے پاس ہماری کلاس کے مردوں کو قابو میں کرنے کے اور جال میں پھنسے ہوئے شکار کو بھلا کوئی اس آسانی سے چھوڑتا ہے؟ اور یہ لڑکی فضا اس کے تو چہرے کے ایک ایک نقش سے ہی نحوست ٹپکتی ہے۔وہ دیکھنے میں ہی چڑیل لگتی ہے لگی!''

بھلا سارہ شاہ نے فضا کو اتنے غور سے کب دیکھا تھا کہ وہ ایسا کہہ رہی تھی' مگر یہ اس کی فضا کے لیے شدید نفرت تھی' جس نے اس کے لہجے کو زہر آلود کر دیا تھا اور وہ اس قدر تعصب سے بول رہی تھی۔

''پھر کیا خیال ہے اس نحوست کو مراد بھائی کے سر سے اتار نہ دیا جائے۔'' لگی نے معنی خیز انداز میں کہا۔سارہ شاہ بری طرح چونکی۔لگی اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی تھی اور اس کی طرف جھکتے ہوئے اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتانے لگی تھی۔

''نہیں نہیں لگی! یہ تو بالکل غلط ہے۔انسانی جان لینا! اوہ میرے خدا!'' سارہ شاہ کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا اور ٹھنڈے پسینے نے اس کی ہتھیلیاں نم کر دی تھیں۔

''ٹھیک ہے تو پھر پڑی رہو یہاں اور عیش کرنے دو انہیں۔'' لگی سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لگی پلیز.....!'' سارہ نے لجاجت سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما۔''میں کیا کروں لگی! مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا.....'' بے بسی لیے اس کا بھرایا ہوا لہجہ لگی کو طیش دلا گیا۔

''میرے خدا! سارہ! تم اس قدر بزدل بھی ہو سکتی ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی..... میں تمہاری جگہ ہوتی تو حشر نشر کر دیتی ان دونوں کا اور تم.....اس دو کوڑی کی لڑکی سے ہار مان کر یہاں چلی آئیں۔اور حلیہ دیکھا ہے اپنا.....لگتا ہے کسی خطرناک بیماری کی مریضہ ہو۔'' لگی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے سارہ کا دماغ درست کر دے۔اسے ان پڑھ گنوار عورتوں کی طرح پل پل میں اس کا آنکھوں میں آنسو بھر لانا اور حالات سے شکست مان کر یہاں پڑے رہنا بالکل بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا۔وہ تو آج ہی فرانس سے آئی تھی اور سارہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''کاش تم جان سکتیں لگی کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے؟'' اس نے بمشکل نچلا لب دانتوں تلے بھینچتے ہوئے سسکیاں روکی تھیں۔

''میں سب سمجھتی ہوں سارہ! اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ خود کو سنبھالو اور باقی سب مجھ پر اور بوبی پر چھوڑ دو۔بھول جاؤ کہ کوئی لڑکی فضا بھی تھی جو مراد بھائی کی زندگی میں آئی تھی۔''

لگی کے سپاٹ اور سرد لہجے پر چند لمحے سارہ شاہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی تھی اور پھر انگلیوں کی پوروں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆.....

''شاباش۔'' لگی نے آہستگی سے اس کا گال تھپتھپایا۔''ہم لوگ سری لنکا جا رہے ہیں دو تین ہفتے کا کام ہے وہاں' جونہی شوٹنگ ختم ہوں گی' ہم پاکستان چلے جائیں گے۔جاتے ہی سب سے پہلے تمہارا یہی کام کریں گے تب تک تم اپنے اس بدحال حلیے کو ٹھیک کرو.....اگلی بار تم سے ملتے ہوئے میں تمہیں اسی پرانی سارہ شاہ کے روپ میں دیکھنا چاہوں گی جسے میں جانتی ہوں' سب جانتے ہیں' اس سارہ شاہ بلکہ سارہ تباہ کو نہیں.....اوکے۔'' لگی نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا اور سارہ شاہ بے دلی سے مسکراتے ہوئے

اثبات میں سر ہلانے لگی۔ پھر کچھ دیر بیٹھ کر لگی تو چلی گئی لیکن سارہ شاہ کو کچھ اور مضطرب کر گئی تھی۔ مانا کہ اسے فضا سے بے حد نفرت تھی مگر اس ساری نفرت کے باوجود وہ شاید یہ انتہائی قدم اٹھانے پر کبھی آمادہ نہ ہوتی اگر اسے مراد شاہ سے دور آ کر یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتی ہے اور ساری زندگی یوں اس سے دور رہ کر نہیں گزار سکتی اور مراد شاہ کی زندگی میں دوبارہ جانے کے لیے اس کی محبت پھر سے پانے کے لیے ضروری تھا کہ فضا کا وجود درمیان سے ہٹ جاتا۔

☆.....☆.....☆

"رجو! یہ خط انور کو دے آؤ کہ ابھی پوسٹ کر دے۔" فضا نے گلابی لفافہ اور پانچ سو کا نوٹ رجو کو تھماتے ہوئے تاکید کی۔

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ!" رجو نے خط اس کے ہاتھ سے لیا اور چور سی نگاہ بیگم صاحبہ پر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"واہ میرے مولا صدقے جاؤں تیری شان کے..... بیٹھے بٹھائے ای موجیں کرا رہا ہے۔" انور نے نوٹ کو چومتے ہوئے خط جیب میں ڈال لیا۔

"دیکھا انور ہم یہ اچھا نہیں کر رہے..... چھوٹی بیگم صاحبہ کتنی اچھی ہیں ہمارا کتنا خیال رکھتی ہیں' بس آج تو جا اور یہ خط پوسٹ کر کے آ۔" رجو نے ملامت بھرے انداز میں انور کو دیکھتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔

"پاگل ہوئی ہے؟ اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار لوں؟ یہ سارے عیش تب تک ہیں جب تک بڑی بیگم صاحبہ امریکا میں بیٹھی ہیں..... انہوں نے آتے ہی چھوٹی بیگم صاحبہ کا تو سمجھو پتہ ہی صاف کر دینا ہے اور ہم دونوں پھر وہی گھن چکر بن کر رہ جائیں گے ایک آ رہا ہے تو ایک جا رہا ہے' سارا دن بس چاکری ہی کرتے رہو۔ ہر وقت چولہوں کے سامنے کھڑے رہ رہ کر میرا تو رنگ ہی جھلس کر رہ گیا تھا۔ اب دیکھو....." انور نے بڑے پیار سے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"مزے تو واقعی میں بڑے ہیں' پر یہ بھی تو دیکھ کہ چھوٹی بیگم صاحبہ بچاری کتنی محنت سے ہر دوسرے دن چٹھی لکھتی ہیں' پھر ذرا سی گیٹ کی بیل بجتی ہے تو اتنی آس سے گیٹ کی جانب دیکھتی ہیں اور پتا ہے آج تو اتنا دل دکھا میرا....." رجو سچ مچ رنجیدہ ہو گئی۔ "صبح جب پوسٹ مین بے بے کا خط لے کر آیا نا تو چھوٹی بیگم صاحبہ لاؤنج میں تھیں ان کی نظر پڑ گئی تیزی سے مجھے آواز دی' خوشی سے مانو کھلی پڑ رہی تھیں۔ میں حیران تھی' وہ تو جب انہوں نے کہا رجو بھاگ کر جا' دیکھنا سارہ باجی کا خط ہو گا' تب مجھے سمجھ آئی کہ وہ کیوں اتنی خوش ہو رہی ہیں' دیکھا انور بس تو یہ چٹھی ڈال کر آ۔" رجو بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

"چل چل زیادہ بکواس مت کر' میرا دماغ خراب نہیں اے اور خبردار رجو دوبارہ الٹی سیدھی بکواس کی ورنہ منہ توڑ کر رکھ دوں گا۔ بڑی آئی ہمدردیاں کرنے والی۔" وہ ایکدم ہتھے سے اکھڑ گیا تھا اور شوہر کو اتنے غصے میں دیکھ کر رجو بھیگی بلی بنی اندر کی طرف مڑ گئی۔

اگلے دن صبح موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ مراد شاہ کی فرمائش پر فضا پراٹھے بنا رہی تھی' تہہ در تہہ پرت والے پراٹھے' دیسی گھی کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور فضا کو دادی بے تحاشا یاد آ رہی تھیں۔ گزرے بے شمار ماہ و سال یاد آ رہے تھے۔ جب پراٹھا کھانے کو دل چاہتا تھا تو دادی سے فرمائش کرنے سے پہلے بیسیوں مرتبہ سوچنا پڑتا تھا۔

"فضا یار! کیا خوشبو آ رہی ہے مجھے تو اپنا بچپن یاد آ گیا ہے۔ کیا زبردست پراٹھے بناتی تھیں اماں جی۔" مراد شاہ کچن میں داخل ہوتے ہوئے بولے تھے اور فضا حیران رہ گئی تھی لیکن پھر اسے اپنی یہ حیرانی بے معنی محسوس ہوئی تھی۔ جن چیزوں سے یادیں وابستہ ہوں انہیں دیکھ کر وہ یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

"شاہ جی! کل اتوار ہے' کیوں نہ ہم لوگ اماں بی کے پاس چلنے کا پروگرام بنائیں؟" فضا نے بڑے پرشوق لہجے میں پوچھا۔ مراد شاہ دو تین بار اماں بی کے پاس چلنے کا پروگرام بنا کر ملتوی کر چکے تھے۔

"ہاں' دیکھتے ہیں۔"

فضا نے غور کیا انہوں نے کچھ زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود ناشتے کے دوران اس نے پھر اپنا سوال دہرایا تو پھر ذرا سے توقف کے بعد خود ہی آگے بات شروع کر دی۔

''ایک عجیب بات ہے شاہ جی' میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ ایک چیز جو کسی کے لیے بے حد اہم' بہت قیمتی اور بہت خاص ہوتی ہے' وہی چیز جس کے پاس موجود ہو اسے اس کی قدر و قیمت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ماں کی محبت نہیں دیکھی لیکن میرا دل اس محبت کے لیے ترستا رہا ہے۔ میں سوچتی ہوں کیسی ہوگی اس ہستی کی محبت جس کی مثال خود اللہ پاک نے دی ہے کہ میں تمہیں ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہوں' یعنی محبت کے شدید احساس کو ماں کی ممتا کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ کتنا رتبہ ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ماں کا اور اسی ماں کو آج کی اولاد کیا رتبہ دیتی ہے؟ اس ماں کو جو اپنے منہ کا نوالہ بھی اپنے بچوں کو کھلا دیتی ہے۔ خود ہر تکلیف سہہ لیتی ہے لیکن اولاد کو حتی الوسع آرام اور آسائشیں دینے کی کوشش کرتی ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہتے ہوئے چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی۔ ''اولاد کے پاس ماں کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا' ان چند ہفتوں میں کتنے خط آئے ہیں آپ کے خانساماں کی بے بے کے ہر خط میں بس مل جانے کی خواہش کا اظہار کیا ہوتا ہے اور وہ ہے کہ اس کو پروا ہی نہیں اور اسی طرح آپ بھی .....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی اور تاسف بھرے انداز میں انہیں دیکھنے لگی تھی جبکہ مراد شاہ اس کی نگاہوں سے بے خبر اپنے تصور کے ساتھ ساتھ کہیں دور جا نکلے تھے۔

جب فضا ان کی طرف سے مایوس ہوگئی تھی تو انہوں نے اسے تیاری کرنے کے لیے کہا تھا۔ بارش رکتے ہی انہیں گاؤں کے لیے روانہ ہونا تھا۔ فضا کا دل مارے خوشی کے بلیوں اچھل رہا تھا۔ آخر کو وہ ایک ماں سے اس کا بیٹا ملوانے لے جا رہی تھی۔ کیا خبر اللہ کو اس کی یہ ادا پسند آ جائے اور اس کا امان بھی اس سے آن ملے۔ سارہ شاہ کا دل پسیج جائے۔ آنکھوں میں پھیلتی نمی کو ہتھیلی سے صاف کرتی ہوئی وہ اپنے اور مراد شاہ کے کپڑے نکالنے لگی تھی۔ قدرت بھی اس کی ہم نوائی پر آمادہ تھی کہ کچھ ہی دیر مینہ برس کر مطلع صاف ہوگیا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکے موسم کو بے حد خوشگوار بنا رہے تھے۔ فضا نے جلد ہی ضرورت کی ساری چیزیں پیک کر لیں جبکہ مراد شاہ نے کچھ فون کیے اور یوں دو تین گھنٹوں کے بعد وہ گاؤں کے لیے رواں دواں تھے۔ مراد شاہ جو پہلے کچھ سنجیدہ سے نظر آ رہے تھے اب ان کا موڈ بھی خوشگوار ہوگیا تھا اور وہ دھیرے دھیرے فضا کو اپنے گھر والوں کے بارے میں بتا بھی رہے تھے۔

دن کا پنچھی دور افق کے پار اپنے بسیرے میں لوٹ رہا تھا جب ان کی گاڑی اس حویلی نما گھر کے گیٹ پر رکی تھی۔ فضا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''پتا نہیں اس کا استقبال کس طرح ہوگا' کہیں ایسا نہ ہو کہ.....'' ذرا سی سوچ کو ذہن میں جگہ دیتے ہی طرح طرح کے واہمے اور وسوسے فوراً اس کے دل میں گھر کرنے کو لپکے تھے لیکن فضا نے فوراً ہی سر جھٹکتے ہوئے سارا دھیان سامنے غروب ہوتے سورج پر مرکوز کر دیا تھا۔ جو بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

''فضا! تم گاڑی میں ہی بیٹھنا..... میں پہلے تمہارے بارے میں اماں بی کو بتا دوں گا۔'' مراد شاہ نے ہارن دیتے ہوئے فضا سے کہا اور اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

گیٹ کھلنے کی آواز پر فضا کی تمام تر حسیات اندر کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔ کھچڑی بالوں اور بے ترتیب سی سفید اور کالی داڑھی والے ملازم نما شخص نے گیٹ کھولا تھا اور مراد شاہ پر نظر پڑتے ہی خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ کہاں تو وہ ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں گیٹ کھول رہا تھا اور اب جیسے اس کے جسم میں بجلی سی بھر گئی تھی۔ تیزی سے اندر جا کر اس نے گیٹ کھولا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور تیز تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔ گاڑی سرخ پختہ روش کو عبور کر کے ایک قدرے اونچے برآمدے کے سامنے کھڑی کر کے مراد شاہ گاڑی سے اترے ہی تھے کہ اندر سے سفید براق دوپٹے اور ہلکے آسمانی رنگ کے لان کے سوٹ میں ملبوس' مسرت سے نہال' ہانپتی کانپتی اماں بی برآمد ہوئی تھیں۔ خوشی سے نم ہوتی آنکھوں اور کپکپاتے لبوں کے ساتھ وہ مراد شاہ کو چوم رہی تھیں' ڈھیروں دعائیں دے رہی تھیں۔ فضا کا دل مامتا کے اس مظاہرے کو دیکھ کر بے حد گداز ہو رہا تھا۔ وہ بھی تو ایک ماں تھی اور کب سے اپنی اولاد کو سینے سے لگانے کے لیے ترس رہی تھی لیکن وہ مایوس نہیں تھی اس کے دل میں بے حد وسعت تھی' خلوص تھا' محبت تھی اور اسے اپنے اللہ پر بے حد بھروسا تھا کہ وہ بے حد رحیم ہے۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں میں آتی نمی کو صاف کیا اور اماں بی کو دیکھتے ہوئے ایک الوہی سی خوشی کو اپنے دل میں اترتے محسوس کیا تھا۔ مراد شاہ ان کے کندھے پر بازو پھیلائے' انہیں ساتھ لگائے اندر کی طرف بڑھ گئے تھے۔ فضا ادھر ادھر نظر دوڑانے لگی۔ خوب صورت

موڑھوں سے ہٹ کر اس کی نگاہ آموں کے ڈھیروں ٹوکروں پر پڑی تھی' پیلے پیلے صاف وشفاف' چمکتے ہوئے آم بے حد اچھے لگ رہے تھے۔

''یقیناً تازہ تازہ اتار کر لائے گئے ہیں' مگر اتنے ڈھیر سارے شاید کہیں منڈی وغیرہ پہنچانے ہیں.....'' اس نے دل چسپی سے دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ تبھی مراد شاہ اور بی اماں کے ساتھ ایک اونچی لمبی سرخ وسفید خاتون تیل کی بوتل تھامے' داخلی دروازے سے باہر آئی تھی۔ فضا نے کچھ جز بز سی ہوتے ہوئے انہیں دیکھا تھا اور پھر جھجکتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی۔ دونوں خواتین بڑی گرمجوشی سے فضا سے ملی تھیں۔ اماں بی کے سینے سے لگتے ہوئے' ان سے دعائیں لیتے ہوئے بے اختیار فضا کا دل بھر آیا تھا۔ اس نے ماں کی آغوش کا لمس بھی محسوس نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا جیسے ان کے وجود سے انوکھی خوشبو پھوٹ رہی ہو۔ ان کے نرم گرم لمس میں عجیب سی حرارت تھی۔ اماں بی نے دروازے کی دہلیز کے اطراف میں تیل ڈالا تھا' اس کے سر پر سے روپے وار کر پاس کھڑی ملازمہ کو پکڑائے اور وہ خاتون جو اس کی جیٹھانی تھیں' اسے تھامے اندر کی طرف بڑھی تھیں۔ ایسی پزیرائی' اس طرح کے استقبال کی تو اسے ذرہ برابر بھی توقع نہیں تھی خوشی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے چور نگاہوں سے مراد شاہ کی طرف دیکھا جو پہلے ہی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے متوجہ پا کر دلکشی سے مسکرائے۔ کچھ ہی دیر میں مراد شاہ کی بہنیں مع اپنے شوہروں اور بچوں کے آ گئی تھیں۔ وہ بھی فضا سے والہانہ انداز میں ملی تھیں۔

''کرم دین! چلو جلدی سے مرغیاں ذبح کرو میرے بچوں کو بھوک لگی ہوگی۔'' اماں بی کو فوراً ان کے کھانے پینے کی فکر ہوئی۔

بڑے سے صحن میں ایک طرف دیوار کے ساتھ آڑو انار اور بادام کے درخت لگے ہوئے تھے جبکہ دوسری دیوار کے ساتھ جو سرسبز وشاداب بیلوں کے ساتھ ڈھکی ہوئی تھی' کیاریاں بنا کر پودے لگائے گئے تھے۔

ذرا سی دیر میں صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے رنگین پایوں والی بڑی بڑی نواڑ کی چارپائیاں بچھا دی گئی تھیں' جن کے اوپر بے حد نفیس کڑھائی والی سفید چادریں بچھی بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ہر سو پھیلی رات کی رانی کی مہک اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اور اتنی بے تحاشا محبتیں اور چاہتیں فضا کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ جنت میں آ گئی ہو۔ دل چاہتا تھا وہیں کچی مٹی پر جبیں ٹیک دے اور اپنے اللہ کا شکر ادا کرے جو اسے اس کی اوقات سے زیادہ نوازتا جا رہا تھا۔ دادی کے پاس ہوتے ہوئے جب وہ صبح صبح انہیں بڑے جذب کے عالم میں سورۂ رحمن کی اس آیت

''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

کو بار بار پڑھتے اور اس کا ترجمہ کرتے سنتی تو سوچتی' پتا نہیں دادی کے نزدیک کون سی چیز بہت بڑی نعمت ہے' اسے تو اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ اور ایک بار جب اس نے یہی سوال دادی سے کیا تھا تو وہ اسے اپنے ساتھ باہر بڑی سڑک پر لے گئی تھیں۔ جہاں دونوں پاؤں سے معذور ایک نابینا فقیر لکڑی کی ریڑھی میں پڑا تھا۔

''اللہ اگر چاہتا تو مجھے یا تمہیں بھی اس شخص کی جگہ پر ڈال سکتا تھا فضا بیٹی' لیکن اس نے ہمیں یہ دو پاؤں دیئے جن سے چل کر ہم جہاں جانا چاہتے ہیں' جاتے ہیں اور یہ دو آنکھیں جن سے ہم ربّ کی بنائی ہر چیز کو دیکھتے ہیں کیا اس سے بڑی کوئی اور نعمت ہو سکتی ہے؟''

''نہیں ہرگز نہیں۔'' فضا کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

دادی نے بچپن سے ہی شکر گزاری کا جذبہ یوں اس کے دل میں بھر دیا تھا کہ پھر ساری زندگی کسی چیز کی کمی نے اسے اگر کبھی تنگ بھی کیا تو یونہی وقتی طور پر اور اب تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ وہ اپنے اللہ کی ان ساری نعمتوں کا شکر کیسے ادا کرے۔

رات کو مراد شاہ کے سونے کے بعد وہ آہستگی سے اٹھی اور وضو کر کے جائے نماز پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ آنسو اک تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ شکرانے کے دو نفل ادا کرنے کے بعد جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان بہتے آنسوؤں میں کچھ اور روانی آ گئی تھی۔ اس کے پاس الفاظ نہیں تھے جن سے وہ اپنے ربّ کا شکر ادا کر سکتی۔ وہ

فضا جس نے اپنی بوڑھی دادی کے ساتھ ایک ٹوٹے پھوٹے سے کمرے میں زندگی گزاری تھی۔اس چھوٹے سے گھر میں کبھی کرایے کی فکر ہوتی تو کبھی راشن پانی کی..... وہ فضا جو لوگوں کے خوف سے ہر وقت گھر ہی میں مقید رہا کرتی..... وہ فضا جو اپنا پڑھنے کا شوق پھٹے پرانے اخباروں اور ردی والے سے پرانی کتابیں اور رسالے لے کر پورا کرتی تھی۔وہ فضا جو دادی کی وفات کے بعد بالکل تنہا بے آسرا اور بے گھر تھی' اس پر اللہ یوں مہربان ہوا تھا کہ اسے فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا تھا۔وہ کیسے اپنے اللہ کا شکر ادا کرتی اور کس کس نعمت کا شکر ادا کرتی' الفاظ نہیں تھے بس شکر کے آنسو تھے جو اک تواتر سے آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

اگلے دن گھر میں بے حد چہل پہل تھی۔اس کی تینوں نندیں اور بی اماں سب بے حد مصروف نظر آ رہی تھیں۔اس نے بی اماں سے پوچھا تو وہ خوشدلی سے مسکرائیں۔

''ارے میری بھولی دھی رانی شام کو برادری کے کچھ نزدیکی لوگوں کو کھانے پر بلایا ہے میں نے' آخر کو میری بہورانی آئی ہے' میرے مراد کی دلہن' میرے امان کی ماں' سب سے نہیں تو قریبی رشتے داروں سے تو ملواؤں گی تمہیں.....'' وہ کہہ رہی تھیں اور فضا کا ذہن ''میرے امان کی ماں'' کے لفظوں میں اٹک کر رہ گیا تھا۔دل میں اک عجیب سی خوشی ہلکورے لینے لگی تھی۔لیکن صرف چند لمحوں کے لیے..... پھر ایک عجیب سے ملال نے اس کے دل میں سر ابھارا تھا۔

''بھلا شاہ جی کو انہیں یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔یہ انہوں نے اچھا نہیں کیا.....'' اس نے تاسف سے سوچا تھا۔جب یہی بات اس نے مراد شاہ سے کہی تو وہ چند لمحے حیرانی سے اسے دیکھتے رہے تھے۔پھر سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

''یہ حقیقت ہے فضا' اور حقیقت کبھی چھپتی ہے نہ خواہ مخواہ اسے چھپانے کی کوشش کرنی چاہیے اور دوسری بات یہ کہ یہ تمہارا حق ہے۔تمہیں اپنا حق لینا بھی آنا چاہیے اور اس کی قدر و قیمت بھی معلوم ہونی چاہیے۔'' انہوں نے آخری جملے پر خاصا زور دیتے ہوئے کہا۔وہ بہت کچھ کہنا چاہتے ہوئے بھی خاموشی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔وہ شاید انہیں اپنے دل کی کیفیت نہ سمجھا پاتی جو پہلے ہی اتنا کچھ پا کر اس قدر سرشار تھا کہ شکر کے لیے الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔وہ حق جو اس نے کسی کو سونپ دیا تھا' جسے انعام سمجھ کر کسی نے سینے سے لگا لیا تھا' اعزاز سمجھ کر ماتھے پر سجا لیا تھا' اسے واپس لے کر کیا وہ ایسی مسرت و سرشاری سے رہ پاتی۔

''نہیں..... کبھی نہیں۔'' اس نے سوچا۔

تھوڑے تھوڑے کہتے بھی کافی رشتے دار جمع ہو چکے تھے۔کھانے کا انتظام قالینوں پر سفید چادریں اور ان کے اوپر دسترخوان بچھا کر کیا گیا تھا۔فضا کو سب سے زیادہ جو بات پسند آئی تھی وہ مردوں اور عورتوں کا علیحدہ انتظام تھا' ورنہ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ مراد شاہ کے حلقۂ احباب کی طرح یہاں بھی مردوں کا اکٹھا ہی انتظام ہوگا۔خواتین اشتیاق اور حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھیں اور بی اماں فخر سے اس کا تعارف کروا رہی تھیں۔

میرے مراد کی دلہن! امان کی ماں۔''

وہ شاہ جی کی بیوی تھی' کیا اس کا صرف یہ تعارف کافی نہیں تھا۔''شاید نہیں..... یقیناً نہیں۔''

پل میں ہی اسے ہر طرف سے امان کے نام کی گردان سن کر یہ ادراک ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

''ہائے مسز مراد آپ تو پہچانی نہیں جا رہیں' کیا بیمار رہی ہیں آپ؟'' مسز احراز نے بے حد حیرانی سے سارہ شاہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔اس دلدوز حادثے کے بعد آج پہلی بار وہ کسی تقریب میں آئی تھی اور وہ بھی خود پر انتہائی جبر کر کے صرف امان کی خاطر' اس کے دوست کی سالگرہ تھی۔

شازب کی والدہ کے ساتھ سارہ شاہ کی بھی اسکول میں چند ایک بار ملاقات ہو چکی تھی۔اس نے اسے بھی مدعو کیا تھا اور نہ صرف مدعو کیا تھا بلکہ خاصا اصرار بھی کیا تھا۔اس لیے مجبوراً سارہ شاہ کو آنا پڑا۔لیکن اب یہاں آ کر وہ پچھتا رہی تھی کہ اس تقریب میں کچھ اور جاننے والے بھی مل گئے تھے۔ہر شخص اسے دیکھ کر حیران تھا اور اس کی صحت کے بارے میں استفسار کر رہا تھا۔سب کو مطمئن کرتے کرتے سارہ شاہ خود سخت اضطراب کا شکار ہو گئی تھی۔جی چاہتا تھا چپکے سے اٹھ کر یہاں سے غائب ہو جائے لیکن ایسا بھی

نہیں کرسکتی تھی۔ بہت دنوں کے بعد امان کے چہرے پر خوشی واطمینان کے رنگ نظر آرہے تھے۔ اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ وہ خوب مزے کررہا تھا۔ وہ اس کی اس معصوم سی خوشی کو اپنے اضطراب کی نذر نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ پھیلائے خود پر خوش وخرم ہونے کا مصنوعی خول چڑھائے وہاں موجود تھی لیکن اپنی وہاں موجودگی پر اسے اس وقت سخت پچھتاوا ہوا تھا جب اس نے شاہد خان اور روبینہ شاہد کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔

روبینہ شاہد کے والدین پاکستان میں سارہ شاہ کے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ ''یقیناً انہیں اب تک مراد شاہ کی دوسری شادی کی خبر مل چکی ہوگی۔''

انتہائی بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سارہ شاہ نے سوچا اور اضطرابی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ چپکے سے ان کی نگاہ سے بچ کر ہال سے نکل جائے لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ انہوں نے اسے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی تیزی سے ہاتھ ہلایا۔ سارہ شاہ نے کبھی خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا جتنا وہ اس وقت کررہی تھی۔

''ہائے سارہ! کیسی ہو ڈیئر؟'' چند لمحوں بعد وہ اس کے گال پر بوسہ دیتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''ٹھیک..... تم لوگ تو انڈیا گئے ہوئے تھے نا! کب واپس آئے؟'' سارہ نے بھی جواباً حتی الوسع خوشدلی کا مظاہرہ کیا۔

''ہمیں آئے تو کافی دن ہوگئے ہیں تمہاری طرف چکر لگانا تھا ہم لوگوں کو لیکن نومی کو انفیکشن ہوگیا تھا۔ اس وجہ سے بے حد پریشان رہے۔''

''ہیلو مسز مراد..... کیسی ہیں آپ؟'' شاہد خان بھی قریب چلے آئے۔

''میں ٹھیک ہوں۔''

''مسز مراد! انتہائی افسوس ہوا ہم سب کو آپ جیسی بیوی کی موجودگی میں یہ اقدام..... سراسر پاگل پن ہے ہمیں تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ مراد شاہ ایسا کرسکتے ہیں اور اگر ضرور شادی کرنی ہی تھی تو آپ کی ٹکر کی خاتون تو لاتے لیکن سچ ہے کہ دل آنے لگے تو گدھی پر بھی آجاتا ہے۔'' وہ حلق پھاڑ کر ہنسے۔

سارہ شاہ کو اپنے وجود کو سنبھالے رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس کا سارا وجود، تمام طنطنہ جیسے کسی نے خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا۔ وہ فق ہوتے چہرے کے ساتھ لب چباتی ہوئی خود پر قابو پانے کی کوشش کررہی تھی۔ شرمندگی اور ندامت کیسے منہ چھپانے پر مجبور کرتی ہے یہ اسے آج پتا چلا تھا' تحقیر کسے کہتے ہیں..... ذلت کیا ہوتی ہے..... یہ بھی اس نے اسی پل جانا تھا..... دل چاہتا تھا بنا کسی کی طرف دیکھے بھاگتی ہوئی یہاں سے دور چلی جائے یا پھر زمین پھٹے اور اس میں سما جائے۔ شاہد خان نے یوں بھری محفل میں اسے تماشا بنا کر جانے کس جنم کا بدلہ لیا تھا۔ سب جاننے والے شاہد خان کی آواز سن کر اس کے قریب آچکے تھے اور اب اپنے اپنے انداز میں ہمدردی اور تاسف کا اظہار کررہے تھے۔ مسز احراز نے سارہ شاہ کے بے تحاشا سرخ چہرے اور جلتی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات امڈتے محسوس کرتے ہی فوراً آگے بڑھی تھیں۔

''مسز مراد! شاید آپ کا سیل بند ہے۔ میرے گھر کے نمبر پر مراد صاحب کی کال ہے' کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ بڑی اپنائیت سے سارہ کو اس مجمع سے نکال کر اندر اپنے بیڈروم میں لے آئی تھیں۔

''مسز احراز آپ.....!'' مارے ممنونیت کے لفظ سارہ کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے تھے اور وہ ان کا ہاتھ تھام کر بے تحاشا رو دی تھی۔ کیسا دن تھا آج جب وہ ایک سے ایک نئے احساس سے دوچار ہورہی تھی۔ ہر چیز کو ہر جذبے کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرنے والی سارہ شاہ مسز احراز کی اس اپنائیت پر ممنون ہورہی تھی۔ پھر بہت دیر وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روتی رہی تھی اور مسز احراز اسے ساتھ لگائے چپ کرانے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو تھوڑی دیر میں یہاں آرام کرلوں؟ آپ اپنے مہمانوں کو دیکھ لیں' طبیعت ذرا سی سنبھلتے ہی میں چلی جاؤں گی۔ آپ پلیز امان کو تقریب کے بعد چھوڑوا دیجیے گا۔ معذرت چاہتی ہوں آپ کو بے حد تکلیف دی۔'' سارہ شاہ نے رک رک کر کہا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں مسز مراد! آپ فکر نہ کریں میں سنبھال لوں گی۔'' مسز احراز نے فوراً اس کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

پھر جب وہ گھر پہنچی تو شازمہ بھابی آئی ہوئی تھیں۔ سارہ شاہ مرے مرے قدموں سے سٹنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ جتنا اس وقت وہ کسی سے بھی سامنا ہونے سے بچنا چاہتی تھی اتنا ہی کرنا پڑ رہا تھا۔

''کیسی ہو سارہ! کبھی ہماری طرف بھی آ جایا کرو۔ وہ بھی تمہارے بھائی کا گھر ہے کئی مرتبہ فون کیا مگر ثمین نے بتایا کہ تم سو رہی ہو۔'' اس سے گلے ملتے ہوئے وہ خلوص سے کہہ رہی تھیں۔

بے اختیار سارہ شاہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''کیا بات ہے سارہ!'' ثمین اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی بری طرح پریشان ہوئی تھی۔ ''سارہ تم روتی رہی ہو..... اور امان کہاں ہے؟''

اس کے سرخ چہرے اور متورم آنکھوں کو دیکھتے ہوئے یکدم کسی انہونی کے خیال سے متوحش ہوتے ہوئے اس نے تیزی سے پوچھا۔

''وہ وہیں ہے مسز احرار اسے چھوڑ دیں گی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اس وجہ سے میں چلی آئی۔'' جانے کیسے دلی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے اس نے جملہ مکمل کیا تھا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا اس کے گلے لگ کر دہاڑیں مار مار کر روئے۔ کیسا وقت آ گیا تھا کہ ہمیشہ ہنستے رہنے والی سارہ شاہ کو ہر وقت رونا آنے لگا تھا۔ لبوں کو دانتوں تلے دباتے ہوئے تیز تیز قدموں سے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھی تو شازمہ بھابی اور ثمین فکرمندی اس کے پیچھے آئیں اور اسے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر بری طرح پریشان ہو گئی تھیں۔

''سارہ پلیز! کچھ بتاؤ تو سہی' ہوا کیا ہے؟'' ثمین نے اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے دل گداز لہجے میں پوچھا تھا۔ شازمہ بھابی بھی ہمدردی سے اسے دیکھتی قریب آ بیٹھی تھیں۔ سارہ نے سسکیوں پر قابو پانے کی سعی کی تھی لیکن ناکام رہی تھی۔ وہ اس وقت تنہائی چاہتی تھی' کھل کر رونا چاہتی تھی' مگر.....

''سارہ!'' شازمہ بھابی نے دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا تھا۔

''کیا اب میں دل چاہنے پر رو بھی نہیں سکتی.....؟'' یکدم اس نے کھولتے دماغ سے سوچا۔

''بھابی خدارا مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔'' ایک دم اس نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا اور بیڈ پر گرتے ہوئے تکیے میں منہ چھپا لیا۔ ثمین نے بے بسی سے شازمہ بھابی کی طرف دیکھا پھر ان کے اشارے پر اٹھ کھڑی ہوئی تھی دونوں اس کی گھٹی گھٹی سسکیوں پر دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے کمرے سے نکل آئی تھیں۔

''کیا حال کر لیا ہے سارہ نے اپنا.....'' کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد شازمہ بھابی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''بہت سمجھاتی ہوں بھابی لیکن.....'' ثمین بے حد افسردہ تھی' سارہ کی دبی دبی آوازیں اس کے دل کو بے چین کر رہی تھیں۔

''المیہ بھی تو بہت بڑا ہوا ہے اس کے ساتھ..... آہستہ آہستہ ہی سنبھال پائے گی خود کو' ابھی تو شکر ہے یہاں ہے' جہاں کسی کو دوسرے کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی عادت نہیں ورنہ اگر پاکستان میں ہوتی تو اب تک پاگل ہی ہو چکی ہوتی۔''

''اللہ نہ کرے بھابی!'' بے اختیار ثمین کے منہ سے نکلا۔ شازمہ بھابی نے تو ایک عام سی بات کی تھی لیکن ثمین کو وہ بے حد ناگوار گزری تھی اور شازمہ نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔

''ثمین بے شک سارہ تمہاری دوست ہے' تمہارے اس سے دو دو رشتے ہیں یقیناً تمہیں وہ زیادہ پیاری ہو گی لیکن کچھ کم عزیز وہ ہمیں بھی نہیں۔'' شازمہ بھابی نے فوراً کہا اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ دونوں بہنیں بھی سارہ شاہ کو بے حد عزیز رکھتی تھیں۔ وہ فطری سی رقابت جو عموماً اس رشتے میں پائی جاتی ہے' انہوں نے کبھی اپنے درمیان پنپنے نہیں دی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے شوہر اپنی اکلوتی بہن کو بے حد چاہتے تھے ان دونوں بہنوں نے والد کی وفات کے بعد بھابیوں کا بہت برا روپ دیکھا تھا' بہت تکلیفیں سہی تھیں تب انہوں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ اپنی زندگیوں میں وہ اس رشتے کو مثالی بنائیں گی' اور اپنا یہ عہد انہوں نے ہمیشہ یاد رکھا

تھا۔

''معذرت چاہتی ہوں بھابی! میرا یہ ہرگز مطلب نہیں تھا' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ثمین نے برملا اعتراف کیا۔

''ہم لوگ تو ابھی پاکستان سے ہو کر آئے ہیں' بچوں نے بہت حرج کیا ہے پڑھائی کا..... اگر ممکن ہو تو تم اور بہروز کہیں گھومنے پھرنے کا پروگرام بنالو۔ میرے خیال میں یہ سارہ کے لیے بہت ضروری ہے۔ کچھ دن ماحول بدلے گا۔'' انہوں نے مشورہ دیا تھا جو ثمین کو پسند آیا اور وہ خود بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی تھی۔

سارہ شاہ' جس نے ہمیشہ ہر نگاہ میں اپنے لیے تحسین دیکھی تھی' رشک دیکھا تھا' یہ پہلا موقع تھا کہ اسے تذلیل سے واسطہ پڑا تھا' اور اب اسے صحیح معنوں میں پتا چلا تھا کہ اس کے ساتھ کیا المیہ ہو چکا ہے۔ اب وہ پہلے کی شان سے ''ہم سا ہو تو سامنے آئے'' کا چیلنج کرتی' تفاخر سے گردن اکڑا کر نہیں چل سکتی تھی۔ دوسروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے کی طرح سر اٹھا کر نہیں چل سکتی تھی۔ فلک شگاف قہقہے نہیں لگا سکتی تھی۔ اس لیے کہ .....

وہ ایک ہاری ہوئی عورت تھی۔

وہ دل جس کی وہ کبھی حکمراں تھی' اب وہاں کوئی اور راج کرتا تھا۔ وہ گھر جو کبھی اس کی ملکیت تھا' اب وہاں کوئی اور بستا تھا' وہ آنکھیں جو اسے سراہتی تھیں' اب وہاں کوئی اور جچتا تھا' یکدم سارہ شاہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں لیکن فوراً ہی انہیں ہتھیلیوں سے پونچھتی ہوئی وہ اک عزم سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''یہ سب ہمیشہ یونہی نہیں رہے گا' ہر چیز' ہر رنگ' ہر جذبے کو پہلی والی حالت میں واپس آنا ہوگا اور اس میں کچھ زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' نفرت سے سر کو جھٹکتے ہوئے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ بیٹھی اور کلینزر سے میک اپ صاف کرنے لگی تھی۔ وہ جو اتنے دنوں سے فضا کو راستے سے ہٹانے کے معاملے میں لگی سے اتفاق کرنے پر بار بار خود کو ملامت کرتی تھی' بے چین اور مضطرب ہو کر ادھر ادھر پھرتی تھی اپنے ارادے پر پشیمان ہوتی تھی' بار بار لگی کو منع کرنے کے لیے فون اٹھاتی تھی' پھر رکھ دیتی تھی اور اب اپنے فیصلے پر مطمئن تھی۔

''اس نے جو کچھ سوچا تھا بالکل ٹھیک سوچا تھا' اسے دنیا میں سر جھکا کر نہیں سر اٹھا کر جینا تھا۔'' اس نے حتمی انداز میں خود کو باور کرایا اور ہر چیز اسے ہمیشہ بنا طلب کیے ملی تھی لڑ کر' جھگڑ کر' زبردستی چھین کر لینا اسے نہیں آتا تھا' اس لیے وقتی طور پر وہ کمزور ضرور پڑ گئی تھی' شکستہ دل بھی ہو گئی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اپنا حق حاصل ہی نہ کر سکتی تھی۔

وہ اپنا شوہر اور اپنا گھر اس عام سی شکل وصورت کی کم حیثیت لڑکی کو سونپ کر خود ساری زندگی یوں آنسو بہاتی رہتی؟ اس کی اوقات ہی کیا تھی کہ وہ سارہ شاہ کے راستے میں آتی۔ یہ تو وہ خود پاگل تھی جو اس کو نکال باہر کرنے کے بجائے خود اس کی ساری راہیں صاف کر آئی تھی۔ اپنی بے وقوفیوں اور نادانیوں پر خود کو ملامت کرتی ہوئی وہ بہت دنوں کے بعد توجہ کے ساتھ اپنی چہرے کی کلینزنگ کر رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے پڑے سیاہ حلقوں اور چہرے کی زردی مائل رنگت کو دیکھتے ہوئے اسے حیرت ہوئی تھی کہ آخر وہ اپنے آپ سے اس قدر بے پروا کیسے ہو گئی تھی۔ اسی مہینے امان کی سالگرہ تھی۔ اس دن وہ وہی سارہ شاہ نظر آنا چاہتی تھی جس پر سے نظریں ہٹانا مراد شاہ بھول جاتے تھے۔ موبائل فون اٹھاتے ہوئے اس نے بیوٹی پارلر سے کل کا ٹائم لیا اور پھر باقی دنوں میں کیے جانے والے اقدام ترتیب دینے لگی۔

☆.....☆.....☆

''رجو..... صفائی ستھرائی کر لی؟'' فضا نے پاؤں پر جلد نرم کرنے والی کریم لگاتے ہوئے رجو کو آواز دی۔

''بس بیگم صاحبہ تھوڑی سی رہتی ہے۔'' رجو نے کہتے ہوئے پرشوق نگاہوں سے فضا کے کھلے کھلے چہرے کو دیکھا تھا۔

''پتا نہیں ہر گزرتے دن کے ساتھ بیگم صاحبہ واقعی اتنی حسین ہوتی جا رہی ہیں یا پھر مجھے ہی لگتی ہیں؟'' رجو نے سوچا۔

''جلدی کر لو..... ابھی بہت کام پڑے ہیں۔'' فضا نے نرمی سے تاکید کی تو وہ سر ہلاتی ہوئی واپس ہوئی پھر رک گئی۔

''کیابات ہے رجو!''

''بیگم صاحبہ! آپ آج کل بہت سوہنی لگتی ہیں جی۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا......'' فضا دھیمے سے ہنسی۔

''اور مسکراتے ہوئے تو آپ اتنی اچھی لگتی ہیں کہ دل چاہتا ہے دیکھتے رہیں۔'' رجو بے اختیار کہہ گئی۔

''اوہو بھئی تمہاری اتنی تقریریں تو مجھے پھلا دیں گی اس لیے اب یہ بھی بتا دو تمہیں میں بری کس وقت لگتی ہوں؟ شاباش! فٹافٹ بتاؤ۔''

''کسی وقت بھی نہیں۔'' اس نے فوراً کہا اور اس نے بالکل سچ کہا تھا۔ اسے چھوٹی بیگم صاحبہ ہمیشہ ہی اچھی لگتی تھیں۔ وہ اتنی نرمی سے بات کرتی تھیں کہ جیسے لبوں سے پھول جھڑ رہے ہوں اور مسکراہٹ تو جیسے اس کے لبوں سے جدا ہی نہیں ہوتی تھی۔ رجو اکثر اسے ایک ٹک دیکھتی رہتی۔ دو سال ہو گئے تھے اسے انور کے ساتھ شادی ہو کر یہاں آئے ہوئے اور ان دو برسوں میں ایک دن بھی اس نے بڑی بیگم صاحبہ کو ملازموں کے ساتھ یوں ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ ہنسنا تو دور کی بات تھی' کسی ملازم کی جرأت نہیں تھی ان سے فالتو بات کرنے کی' ذرا سا مرضی کے خلاف کچھ ہونے پر وہ فوراً جھاڑ کر رکھ دیتی تھیں' جبکہ چھوٹی بیگم صاحبہ کو تو اس نے اب تک کسی سے اونچا بولتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کے تو سارہ شاہ کے جانے کے بعد عیش ہی عیش تھے۔ نہ ہی آئے روز دعوتیں ہوتیں' نہ ہی کوئی خاص مہمان آتے' کھانا چھوٹی بیگم صاحبہ خود بناتی تھیں۔ دن کا بیشتر حصہ وہ دونوں میاں بیوی فارغ ہی ہوتے تھے ورنہ پہلے تو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ آئے روز محفلیں جمتیں' مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

''شاید انور نے ٹھیک ہی کیا کہ بڑی بیگم صاحبہ کو خط پوسٹ نہیں کیے اچھا ہے وہ نہ ہی آئیں تو۔''

پوری تندہی سے کام کرتے ہوئے رجو نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے فضا کو رجو کا جملہ سو فیصد سچ لگا تھا۔ واقعی وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ ایک عجیب سی کشش تھی اس کے چہرے پر جو اب سے پہلے خود اسے بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ نجانے یہ ان ڈھیروں ڈھیر لوازمات اور اچھی خوراک کا کمال تھا جو وہ اپنی بیوٹیشن پلس نیوٹریشن مس ٹینا کی ہدایات پر گزشتہ پورے مہینے سے استعمال کر رہی تھی یا پھر اس نئی روح کی خوشی کا اثر تھا جو اس کے دل و جاں کو نہال کیے ہوئے تھی۔ فضا نے اپنے تازہ تازہ نرم کیے گئے بے حد ملائم اور دراز بالوں میں برش کرتے ہوئے سوچا۔

☆......☆......☆

''اف! یہ رجو کہاں گھس گئی ہے؟'' فضا نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے خاصے کوفت کے عالم میں سرونٹ کوارٹر کی جانب جانے والی راہداری کی جانب دیکھا' پھر بجائے پورچ میں کھڑے رہ کر وقت ضائع کرنے کے اس نے کوارٹر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ انور اندر کچن میں تھا اس لیے وہ ہلکی سی دستک کے ساتھ ہی ادھ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی تھی۔ رجو کمرے میں نہیں تھی۔ شاید باتھ روم میں گئی ہے' وہ اس خیال کے ساتھ واپس پلٹنے کو تھی جب اچانک اس کی نگاہ کھلی الماری سے ہوتی ہوئی فرش پر پڑی تھی اور وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ بے یقینی سے کھلی آنکھوں کے ساتھ وہ ایک ٹک فرش پر بکھرے ان لفافوں کو دیکھ رہی تھی جن پر لکھا پتا اس کی اپنی لکھائی میں تھا۔ دکھ' تاسف' غصہ' حیرانی اور بے یقینی میں گھری وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس پل کیا کر گزرے' شدید تناؤ کی کیفیت میں وہ آگے بڑھی اور جھک کر وہ سب لفافے اکٹھے کر لیے تھے۔ تبھی اس کے پیچھے ساکت و جامد کھڑی رجو آگے بڑھی تھی اور اس نے فضا کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔

''بیگم صاحبہ! ہمیں معاف کر دیں' ہم لالچ میں آ گئے تھے جی! شیطان کے پیچھے لگ گئے تھے' ہمیں معاف کر دیں ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی...... ہم نے آپ کو...... ہم...... بہت برے...... ہمیں معاف کر دیں۔'' فضا کے پاؤں کھینچنے پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اور پھر یونہی روتے ہوئے اس نے اپنی انور کے ساتھ وقتاً فوقتاً ہونے والی تکرار سے لے کر اپنے مان جانے کے فائدے تک سب کچھ بتا ڈالا تھا۔ فضا چند لمحے اسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی پھر ایک گہری سانس لے کر اسے

اٹھنے کے لیے کہا تھا۔

''اگر کچھ لفافے اندر پڑے ہیں تو وہ بھی نکال دو۔'' ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے الماری کی جانب اشارہ کیا تھا۔ رجو جلدی سے اٹھی تھی۔ الماری کے نچلے خانے سے سارے کپڑے نکال کر بستر پر پھینکتے ہوئے اس نے کونے میں پڑے دو اور لفافے لا کر فضا کے ہاتھ میں تھما دیئے تھے۔

''بیگم صاحبہ! ہمیں.....'' بے حد لجاجت سے رجو نے کہنا چاہا تھا لیکن فضا نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''دیکھو رجو اس وقت میں بہت پریشان ہوں' بہتر ہے ایک دو دن میرا تم لوگوں سے سامنا نہ ہو۔ اس لیے تم لوگ اپنے گاؤں انور کی بے بے کے ہاں چکر لگا لو' تو ارتک آ جانا۔''

ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے فضا نے سپاٹ لہجے میں کہا اور تیزی سے کوارٹر سے نکل آئی۔

☆.....☆.....☆

اگلے چند دن میں سارہ شاہ میں آنے والی واضح تبدیلی نے ثمین اور بہروز ہاشمی کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح بیوٹی ٹپس استعمال کرتی' شاپنگ کرتی' تقریبات میں شرکت کرتی' ہشاش بشاش اور نک سک سے تیار سجی سنوری نظر آنے لگی تھی۔ ثمین اور بہروز ہاشمی مطمئن سے ہو گئے تھے۔ اس دن بھی وہ امان کے اسکول جانے کے بعد شاہنواز ہاشمی اور صہیب ہاشمی کی طرف جانے کے لیے تیار تھی۔ چند دن کی مسلسل دیکھ بھال سے اس کی آنکھوں کے حلقے دور ہو چکے تھے اور مرجھائی ہوئی جلد پہلے کی طرح تر و تازہ ہو گئی تھی۔ بلیک جینز کے اوپر اسکائی بلیو کرتا پہنے' تازہ تازہ شیمپو کیے ہوئے بالوں اور مہارت سے کیے گئے میک اپ میں وہ نظر لگ جانے کی حد تک دلکش نظر آ رہی تھی۔ ثمین کے دل میں یونہی کسی موہوم سے وسوسے نے سر ابھارا تھا۔ اور اس نے جلدی سے نگاہ پھیر لی تھی۔

''ثمین! مسز فراست سے بات ہوئی؟ میوزیکل پروگرام اٹینڈ کرنے کا ارادہ ہے ان کا یا نہیں.....؟'' اپنی مخصوص شاہانہ چال چلتی وہ ثمین کے قریب آ کر رکی۔

''بے شک.....'' ثمین کافی کا مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی طرف مڑی تھی۔

''واہ! بہت حسین لگ رہی ہو۔''

''شکریہ۔''

''بے پروا سے انداز میں کہتے ہوئے اس نے گلاسز پر پھونک مارتے ہوئے نادیدہ گرد اڑائی۔

''کس وقت تک آؤ گی؟''

''شام کو امان کو اسکول سے میں اور شازمہ بھابی لے لیں گے تم رہنے دینا اور ہاں درزی کے پاس جاؤ تو میرے کپڑے بھی لیتی آنا۔'' اس نے جلدی جلدی کہا اور پھر سلام کرتی باہر کی جانب بڑھ گئی۔ شازمہ بھابی پاکستان سے تیرہ چودہ سال کی ایک ملازمہ لڑکی لائی تھیں' دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی سارہ کو شازمہ بھابی کے زور و شور سے رونے کی آواز آئی تھی اور اس کا دل جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی تھی لیکن پھر ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ وہ بے شک اس کی بھابی تھیں لیکن یوں اچانک کسی کے سر پر جا کر کھڑے ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ تبھی اسے اندر سے عظمیٰ بھابی کی آواز سنائی دی تھی۔

''آپ تو یوں فکرمند ہو رہی ہیں آپی جیسے پہلی مرتبہ آپ نے بھابی سے ایسی باتیں سنی ہوں' کیا آپ بھول گئی ہیں کہ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں' وہ جو گزشتہ کچھ عرصے سے ہم دونوں بہنوں کی اور خاص طور پر آپ کی اس قدر آؤ بھگت کر رہی تھیں تو صرف اس لیے کہ آپ منال کی شادی نوید سے کر دیں اور اس طرح ان کا نکما اور کام چور بیٹا امریکا میں سیٹ ہو جائے۔ اب جونہی ان کو آپ کی طرف سے مثبت جواب نہ ملا تو وہ فوراً اپنی اوقات پر اتر آئیں جتنی گری ہوئی سوچ کی مالک ہیں وہ' تو ان سے ایسی ہی توقع کی جا سکتی ہے اور آپ یوں رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں جیسے آپ کو علم نہیں ہے ان کے بارے میں..... چلیں اٹھیں' دفع کریں ان کی ہر بات کو۔ بہت رلایا ہے انہوں نے ہمیں' اب

بھی اگر ہم ان کی باتوں کو دل سے لگائیں تو ہم سے زیادہ پاگل کوئی نہیں ہوگا۔'' عظمیٰ بھابی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ اور وہ عجیب سی کیفیت میں گھرتی جا رہی تھی۔

''لیکن عظمیٰ! وہ تو چلو بھابی ہیں ہماری' لیکن بھائی جی بھی پاس ہی تھے۔ میں نے خود پیچھے سے ان کے بولنے کی آواز سنی تھی۔''

''بھائی جی.....؟ چھوڑیں آپی! کوئی اور بات کریں..... بھائی جی نے تو اپنی زبان پہلے دن سے ہی بھابی کے پاس گروی رکھ دی تھی۔ اس لیے ان کی بے زبانی کا گلہ فضول ہے۔'' عظمیٰ بھابی نے تلخی سے کہا۔ ''اچھا چلیں آئیں ناشتا کریں اور کیا خیال ہے آج ثمین کی طرف نہ چلا جائے۔ کافی دن ہو گئے ہیں سارہ سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔'' اس سے پہلے کہ وہ دونوں باہر نکلتیں سارہ شاہ نے قدم آگے بڑھائے تھے اور کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

''سارہ! تم..... واہ کیا بات ہے بھئی؟ میں اور شازمہ آپی ابھی یہی بات کر رہے تھے کہ تم سے مل کر آتے ہیں کیسی ہو؟'' اس سے گلے ملتے ہوئے عظمیٰ بھابی نے خوش دلی سے کہا تھا۔ شازمہ بھابی بھی جلدی جلدی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اور ان سے گلے ملتے ہوئے سارہ شاہ گہری سوچ میں تھی۔ پھر وہ دونوں مل کر اس کی خاطر مدارات میں لگ گئی اور وہ دل ہی دل میں شرمسار ہو رہی تھی۔ یہ دونوں اس کی بھابیاں تھیں جن سے اس کا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن ان دونوں نے ہمیشہ اسے محبت اور مان دیا تھا اور وہ ہمیشہ ان کے خلوص' ان کی محبتوں کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی رہی تھی۔ بلکہ ایک ان پر ہی موقوف کہاں تھا' اس نے تو ہر اک کی محبت کو ہی یونہی لیا تھا وہ کبھی جان ہی نہیں سکی تھی کہ یہ اس کی کتنی بڑی خوش نصیبی تھی کہ اتنی ساری محبتیں اسے حاصل تھیں۔ پھر جب تک وہ وہاں رکی' بار بار اس کا دل چاہتا رہا تھا کہ وہ شازمہ بھابی اور عظمیٰ بھابی کو بتائے کہ وہ بے حد اچھی ہیں اور یہ کہ وہ بھی انہیں بے حد چاہتی ہے۔ ان سے بہت محبت کرتی ہے لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ ہر بار ایک عجیب سی جھجک آڑے آ جاتی کہ وہ کیا سوچیں گی کہ اتنے سال گزارنے کے بعد اب سارہ شاہ کو علم ہوا ہے کہ وہ اچھی ہیں' جب اپنا گھر چھوڑ چھاڑ کر ان کے سہارے پر یہاں آ کر بیٹھی ہے تو.....!

پھر اپنی اس سوچ پر اسے خود ہی حیرت ہوئی تھی۔ یہ وہ کس طرح سوچنے لگی تھی۔ اس نے پہلے تو ایسے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مگر اس نے اس سے پہلے دوسروں کے بارے میں سوچا ہی کب تھا! وہ تو ہمیشہ اپنی ہی ذات کے حصار میں گھری رہی تھی' اپنے ہی بارے میں سوچتی رہی تھی' اس کی زندگی سے وابستہ ہر فرد اس سے بے تحاشا محبت کرتا تھا مگر اس نے خود کسی کو محبت لوٹانی تو دور کی بات تھی' کبھی جتائی تک نہیں تھی۔ آج اسے اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ ثمین اسے یوں کھویا کھویا سا دیکھ کر حیران ہوئی۔ وہ صبح جس قدر پرجوش تھی اب اتنی ہی بجھی بجھی سی نظر آ رہی تھی' ثمین نے ایک آدھ بار پوچھا پر زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے خاموش ہو گئی اور جب ثمین اپنے بیڈ روم میں چلی گئی تو سارہ شاہ جیسے یکدم چونکی تھی' پھر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ جذبوں کے اظہار میں کس قدر ناکام تھی اسے شدت سے احساس ہوا تھا۔ کئی دنوں کے بعد اس رات پھر وہ رات گئے تک جاگتی رہی تھی' عجیب متضاد قسم کی سوچیں تھیں جو اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ شام کو گگی کا فون آیا تھا وہ لوگ چند دن پہلے پاکستان پہنچ چکے تھے اور ایک دو دن میں اسے خوشخبری سنانے والی تھی۔

''مگر کیا واقعی یہ خوشخبری تھی..... اور اگر تھی تو وہ خوش کیوں نہیں تھی..... یہ مسلسل اضطراب اور بے چینی کیوں تھی..... نیند آنکھوں سے دور کیوں تھی.....'' کروٹ بدلتے ہوئے سارہ شاہ نے الجھ کر سوچا تھا اور تھک کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔ ایک نظر امان پر ڈالی جو بے خبر سو رہا تھا آہستگی سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے وہ بستر سے نیچے اتر آئی۔

غیر ارادی طور پر اس نے موبائل فون اٹھایا اور مراد شاہ کا نمبر ملایا تھا لیکن بیل جاتے ہی اسے خیال آیا تھا کہ یہ وہ کیا کر رہی ہے نہ جانے اس وقت وہ کہاں ہوں اور کیا کر رہے ہوں.....؟ اس نے فوراً آف کا بٹن دبایا تھا لیکن دل کچھ اور بوجھل ہو گیا تھا۔

''تو مراد اب آپ سے بات کرنے کے لیے بھی مجھے سوچنا ہوگا۔ بلکہ اب تو میں جب بھی فون کروں وہ بے وقت ہی ہوگا' آپ یقیناً مجھ سے بات نہیں کرنا چاہیں گے لیکن

مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔کیونکہ یہ جو کچھ ہوا ہے میری ہی وجہ سے تو ہوا ہے۔نہ میں آپ کو اس قدر نظر انداز کرتی نہ یہ سب ہوتا۔لیکن اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ میں آپ سے بے تحاشا محبت کرتی ہوں۔شاید اس سے بھی زیادہ جتنی آپ نے مجھ سے کی ہے اب آپ دیکھیں گے کہ مجھ میں کتنی بڑی تبدیلی آئی ہے اور یہ سب صرف اور صرف آپ کو پھر سے پانے کے لیے ہے مراد میں آپ سے بہت محبت کروں گی.....اتنی محبت کہ آپ میرے سوا سب کچھ بھول جائیں گے۔'' سیل فون کو دونوں ہاتھوں میں بھینچتے ہوئے وہ سرگوشی کے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وقت ہمیشہ انسان کے اختیار میں نہیں رہتا نہ ہی خوش نصیبی ہمیشہ اس کی دستک کے انتظار میں رہتی ہے۔

وقت کو ہمیشہ اپنے اختیار میں رکھنا ہو خوش نصیبی کے اس اعزاز کو برقرار رکھنا ہو تو وقت کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آواز کو سننا پڑتا ہے اس کے تقاضوں کو سمجھنا پڑتا ہے۔سارہ شاہ یہ سب نہیں کر سکی تھی اور وقت اس کے ہاتھوں سے پھسل گیا تھا۔

''سارہ.....یہ تمہاری ڈاک آئی تھی کل.....مجھے شام کو بتانا یاد نہیں رہا۔''

صبح ناشتے کے بعد ثمین نے ایک پارسل اس کی طرف بڑھایا۔

''پاکستان سے.....؟'' زیر لب کہتے ہوئے کچھ الجھن آمیز انداز میں سارہ شاہ نے ڈاک دیکھی۔انجان لکھائی تھی۔اس نے پلٹتے ہوئے پارسل کی پچھلی طرف نگاہ ڈالی تھی۔اس کے ذہن میں جیسے جھماکا ہوا تھا۔آنکھوں میں ایک گہری حیرانی اتر آئی تھی۔

''سارہ! ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ڈیڈی انہیں اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔میں جا رہی ہوں۔بچے اسکول سے آئیں گے تو تم انہیں دیکھ لینا۔'' ثمین پریشان سی بیگ کندھے پر ڈالتی بولی۔

''ٹھیک ہے!'' وہ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں ثمین کو دیکھتے ہوئے بولی۔ثمین نے تیزی سے باہر کی جانب قدم بڑھائے تھے۔

''اسپتال پہنچ کر فون کر دینا ثمین۔'' اچانک خیال آنے پر اس نے پکارا تھا اور اس کے جانے کے بعد چند لمحے الجھے الجھے سے انداز میں پارسل کو دیکھتی رہی تھی۔پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کھول لیا تھا اور اس کی حیرت دوچند ہو گئی تھی۔وہ تقریباً بیس پچیس لفافے تھے۔سب سے اوپر والے کے اوپر مارکر سے نمایاں انداز میں تاریخ لکھی گئی تھی' نچلے پر اس سے پچھلے ہفتے کی تاریخ تھی۔ایک ایک کر کے سارہ لفافے اٹھاتی گئی اور سب سے آخری لفافے پر سارہ شاہ کے امریکا آنے کے چند دن بعد کی تاریخ تھی۔اس نے بے اختیار ہی لفافہ کھولا تھا۔اس کی نگاہیں لفظوں پر دوڑنے لگی تھیں۔ایک کے بعد دوسرا' تیسرا.....پھر وہ سب خطوط اس نے پڑھ ڈالے۔بہت دیر وہ پتھر کے مجسمے کی مانند کھوئی کھوئی سی کیفیت میں بیٹھی رہی تھی پھر یکدم جیسے اس پتھر کے مجسمے میں حرکت ہوئی تھی۔وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی اور فون اٹھاتے ہوئے تیزی سے گگی کا نمبر ملایا۔اس کا موبائل فون بند تھا۔ایک بار' دو بار' اور پھر بیسیوں بار اس نے نمبر ملایا تھا۔دور پار کی عزیز رشتے دار اور دوست جو کوئی ذہن میں آ رہا تھا جس کے توسط سے گگی سے رابطہ ہو سکتا' اسے فون کر کے گگی سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہر طرف سے ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تھا۔انتہائی اضطراب کے عالم میں گھر میں ادھر سے ادھر چکراتے ہوئے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔شدید الجھن اور ذہن پر طاری مسلسل تناؤ کی وجہ سے سر جیسے درد کے مارے پھٹنے کو تھا۔کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا کرے.....کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے سب سے اوپر رکھا کاغذ سیدھا کیا تھا۔اس کی آنکھوں کے سامنے وہ سطریں تھیں جنہیں اس کی آنکھوں سے بے اختیار ہو کر نکلنے والے دو قطروں نے پھیلا دیا تھا۔

''سارہ باجی! میری تمام التجاؤں کے جواب میں آپ کی طرف سے مکمل خاموشی میرے لیے کتنی اذیت ناک ہے۔کاش میں آپ کو بتا سکتی۔اگر اب بھی آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو میں سمجھوں گی کہ جیسے باپ کی شفقت اور ماں کی محبت میرا مقدر نہیں' بھائیوں کا تحفظ اور مان میرا مقدر نہیں تھا ایسے ہی کوئی بھی اور رشتہ اللہ نے میرے لیے نہیں بنایا۔آپ کا گھر اور وہاں کی ہر چیز آپ کی منتظر ہے' میں وہاں نہیں گئی' آپ کی کسی چیز کو نہیں چھیڑا' سب کچھ آپ کا ہے سارہ باجی' وہ گھر' اس کی ہر چیز سے لے کر شاہ جی او

رامان تک..... سب کچھ..... میں تو بس آپ لوگوں کی زندگی میں تھوڑی سی جگہ چاہتی تھی' کچھ ایسے رشتے جنہیں میں اپنا کہہ سکوں' جن سے محبت کرسکوں' اور جن کا خیال رکھ سکوں..... لیکن آپ کو اگر یہ منظور نہیں تو کوئی بات نہیں..... بس آپ لوٹ آئیں خدارا' میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کی زندگی سے بہت دور چلی جاؤں گی' کبھی واپس پلٹ کر نہ آنے کے لیے۔"

بے اختیار سارہ شاہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کاغذ پر گرنے لگے تھے۔ تبھی اس کا فون بجا تھا اور اس نے لپک کر بے قراری سے فون اٹھایا لیکن ثمین کا نمبر دیکھ کر اس کی امیدوں پر اوس سی پڑ گئی تھی' بے دلی سے اس نے فون اٹینڈ کیا۔ "اب کیسی طبیعت ہے آنٹی کی.....؟"

"ٹھیک ہیں سارہ! چیک اپ کے بعد ہم لوگ گھر آ گئے ہیں۔ پریشانی والی کوئی بات نہیں..... بس بی پی کچھ بڑھ گیا تھا..... تم سناؤ کیا کر رہی ہو..... اور یہ تمہاری آواز کیوں بھاری ہو رہی ہے.....؟ تم رو رہی ہو سارہ!" ثمین بری طرح بے چین ہو گئی تھی۔

"ہاں ثمین مجھ..... مجھے..... تم..... تمہاری اور بہروز بھائی کی مدد کی ضرورت ہے..... مجھے فوراً پاکستان جانا ہے ثمین!" روانی سے بہتے آنسوؤں کے درمیان اس نے یکدم ہی جیسے فیصلہ کر لیا۔

"خیریت تو ہے سارہ!" ثمین نے متوحش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے ہمیشہ بہت غلطیاں کی ہیں ثمین لیکن اب جو کچھ میں نے کیا ہے وہ تو نہ بتانے کے قابل ہے' نہ معافی کے۔" روتے ہوئے وہ ثمین کو مختصراً پوری بات بتاتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

"سارہ.....!" لکی اسے یوں اپنی سامنے دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔

"لک.....! خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے مل گئیں۔ میں بہت فکرمند تھی کہ پتا نہیں مجھے تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈنا پڑے گا۔ سارا راستہ بس میں یہی سوچتی رہی اور تمہارا فون بھلا کیوں آف تھا.....؟ میں نے بے تحاشہ کالز کیں مگر کوئی جواب نہیں.....؟" بغیر کسی قسم کی سلام دعا کے وہ تیز لہجے میں جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔

"سارہ.....! تم یوں اچانک.....؟ اور پلیز پرسکون ہو کر بیٹھو تو سہی' یہ کیا کہ....." لکی حیران و پریشان سی اس کی طرف بڑھی تھی مگر سارہ کے دل و دماغ پر اس وقت صرف فضا کی فکر سوار تھی۔

"لکی! جلدی کرو پلیز! نومی بھائی کو فون کرو' فضا کو کچھ نہیں ہونا چاہیے..... پلیز لکی!" وہ بے قراری سے بولی تھی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا سارہ.....!" لکی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا.....! کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے لکی کو دیکھنے لگی۔

"ہاں..... بارہ بجے کے قریب نومی کا فون آیا تھا' وہ کہہ رہا تھا ابھی تھوڑی ہی دیر میں مجھے کامیابی کی خبر سنائیں گے۔ اس وقت وہ فضا کی گاڑی کے بالکل قریب تھے پھر میں فون بند کر کے سو گئی تھی۔ ابھی اٹھی ہوں تو فون کیا ہے مگر نومی کا سیل فون آف ہے' اچھا تم آؤ تو سہی..... یہ کیا.....!" وہ کہہ رہی تھی لیکن سارہ شاہ اس کی پوری بات سنے بغیر پلٹی اور بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے آتے دیکھ کر فوراً ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اگلے ہی لمحے وہ ٹیکسی کو اس کے بتائے ہوئے راستوں پر بھگا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

"صاحب جی..... صاحب جی..... ابھی ابھی رجو کا فون آیا ہے جی! وہ بتا رہی ہے کہ وہ اور بیگم صاحبہ اسپتال میں ہیں..... پھر فوراً ہی لائن کٹ گئی صاحب جی! میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب میں کیا کروں..... شکر ہے آپ آ گئے جلدی سے بیگم صاحبہ کو فون کریں جی..... وہ خیریت سے تو ہیں دوپہر سے شام ہو گئی ہے پتا نہیں کیا ہوا ہے جو رجو

اسپتال سے..... اللہ خیر کرے۔" مراد شاہ گاڑی سے نکلے ہی تھے جب انور کے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہے گئے جملوں نے انہیں جیسے منجمد کر دیا تھا۔ پھر خود کو سنبھالتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھ رہے تھے جب انور کی حیران و پریشان سی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"بیگم صاحبہ جی آپ.....!" وہ ہڑبڑا کر پلٹے اور اپنے پیچھے کھڑی پھیلی پھیلی آنکھوں اور پتھر کے مجسمے کی مانند ساکت و جامد کھڑی سارہ شاہ پر نظر پڑی تھی۔ وہ ایک ثانیے کو حق دق سے اسے دیکھتے رہے تھے تبھی بے حد آہستہ آواز میں اس کے لبوں سے سرگوشی کے سے انداز میں نکلنے والے جملے نے ان کے جسم سے جیسے روح کھینچ لی تھی۔

"میں نے اس کو اپنی راہ سے ہٹا دیا' قتل کروا دیا میں نے اس کا..... قتل..... ابھی وہ آئے گی..... اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے نہیں..... اسٹریچر پر..... اس کی میت....." وہ اور بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر مراد شاہ کی سماعت جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ بے جان ہوتے جسم اور بے یقینی سے پوری کھلی آنکھوں کے ساتھ وہ اسے دیکھ رہے تھے' قدموں تلے کی زمین ریت کی مانند انہیں پاؤں کے نیچے سے کھسکتی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دم ان کے جسم میں حرکت ہوئی' انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے وجود میں اک آتش فشاں دہک اٹھا ہو.....

"تم..... ذلیل..... عورت۔" وہ لپک کر سارہ شاہ کی طرف بڑھے اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔

"میں..... میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا سفاک عورت!"

"شاہ جی..... شاہ جی یہ کیا کر رہے ہیں آپ.....؟" فضا پوری طاقت سے انہیں پیچھے کھینچتے ہوئے چلائی۔

"فضا.....! وہ یوں آنکھیں پھاڑے فضا کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ فضا نہیں بلکہ اس کی روح ہو۔

وہ ان کی کیفیت سے بے خبر لپک کر سارہ کی طرف بڑھی تھی جو گلے پر ہاتھ رکھے بری طرح کھانس رہی تھی۔

"رجو! پانی لاؤ جلدی سے کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو؟' رجو کو ڈپٹتے ہوئے اس نے سارہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ آ گئیں نا سارہ باجی مجھے یقین تھا' آپ ضرور آئیں گی۔" مارے خوشی کے فضا کی آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی تھی۔ "آئیں آپ..... اندر آئیں....." وہ سارہ شاہ کا ہاتھ تھامے اسے اندر کی طرف کھینچ رہی تھی۔ مراد شاہ کچھ دیر کھڑے ٹکر ٹکر اس کا منہ دیکھتے رہے تھے پھر تیزی سے آگے بڑھے اور ایک جھٹکے سے سارہ شاہ کے بازو کو فضا سے چھڑایا اور اسے باہر کی طرف دھکا دیا۔

"نہیں آ سکتی یہ اندر..... ہرگز نہیں....."

"کیا ہو گیا ہے شاہ جی آپ کو..... کیوں آپ اس طرح کر رہے ہیں؟ کتنی مشکل سے میں نے انہیں آنے کے لیے راضی کیا ہے' کتنے خط لکھے ہیں میں نے انہیں اور اب جب وہ آ گئی ہیں تو آپ ایسے کر رہے ہیں؟ کیوں شاہ جی! کس لیے؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"فضا یہ..... یہ عورت تمہاری دشمن ہے تم اسے نہیں جانتیں..... یہ کس قدر خود غرض' بے حس اور سنگدل ہے تمہیں کچھ خبر نہیں....."

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں شاہ جی! کیوں میری ساری خوشی ملیا میٹ کر رہے ہیں' آپ جانتے ہیں نا میں نے اس دن کے لیے کتنی دعائیں کی ہیں۔" وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے التجائیہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ مراد شاہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کریں کیسے اسے سمجھائیں وہ تو جیسے ان کی کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ سارہ شاہ نے چند گھونٹ پانی پیا اور گلاس رجو کو تھماتے ہوئے خالی خالی نگاہوں سے مراد شاہ اور فضا کو دیکھا۔

"شاہ جی! مجھے یقین ہے اللہ نے سارہ باجی سے ملانے کے لیے ہی آج مجھے بچایا ہے' اتنا خوفناک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سامان سے بھرا ٹرک ہماری گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا میں نے تو آنکھیں بند کرتے ہوئے کلمہ بھی پڑھ لیا تھا پھر پتا نہیں کیا ہوا جیسے کسی فرشتے نے پل میں اسٹیئرنگ تھام کر گاڑی سائیڈ پر کر دی..... اور اسپتال تو یہ رجو مجھے ضد کر کے لے گئی ورنہ مجھے تو ایک خراش تک نہیں آئی۔" فضا نے جھرجھری لیتے ہوئے بتایا۔ اس کا مقصد مراد شاہ کو زم کرنا تھا۔ سارہ شاہ نے سینے پر ہاتھ رکھتے

ہوئے گہری سانس لی اور مراد شاہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔اس کا خوب صورت چہرہ آج انہیں انتہائی کریہہ دکھائی دے رہا تھا۔

وہ خودغرض تھی

خود پرست تھی

بے حس تھی

لیکن.....!

وہ اس قدر سنگدل بھی ہو سکتی تھی.....

اس قدر پستی میں بھی گر سکتی کہ کسی کی جان لینے پر ہی تل جائے۔وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔انہیں خود پر شرم آ رہی تھی کہ انہوں نے اس عورت سے محبت کی تھی' اپنی زندگی کے بے حد قیمتی ماہ و سال اس کی اک اک ادا پر نثار ہوتے بسر کیے تھے۔

''کیا یہ عورت اس قابل تھی کہ اس سے محبت کی جاتی؟ اس پر نثار ہوا جاتا.....نہیں.....ہرگز نہیں.....'' انتہائی نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے سوچا۔اور اس نگاہ نے سارہ شاہ کو کاٹ کر رکھ دیا۔اس نے پوری شدت سے آنکھیں میچ لی تھیں۔دل کا کرب آنسو بن کر آنکھوں سے بہنے کے بجائے اس کی رگوں میں دوڑنے لگا۔کتنا مشکل ہے کسی کی نگاہوں سے گر کر جینا اور وہ بھی اس شخص کی جسے آپ دل و جان سے چاہتے ہوں' جس کی نگاہوں میں سرخرو ہونا چاہتے ہوں۔

''فضا! پلیز سمجھنے کی کوشش کرو' یہ عورت کبھی بھی تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی' یہ تمہیں.....تمہیں کیسے سمجھاؤں میں.....کیسے سمجھاؤں۔'' مراد شاہ نے سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔اذیت سے لبوں کو کچلتے ہوئے سارہ شاہ نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''یہ تم سے نفرت کرتی ہے فضا اسے صرف نفرت کرنا آتی ہے۔صرف نفرت' یہ فضا نہیں سارہ شاہ ہے' سارہ شاہ جو کبھی محبت نہیں کر سکتی۔'' سارہ کو محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہوں۔اس سے پہلے کہ ان ٹکڑوں سے رستا لہو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلتا اور ایک ایک ٹکڑا چلا چلا کر اس محبت کا اظہار کرنے لگتا جو اب تک اس کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی تھی' وہ کانوں پر ہاتھ رکھتی بھاگتی ہوئی گیٹ سے نکلتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

دو دن.....صدیوں اور قرنوں جیسے طویل دو دن گزر چکے تھے۔سارہ شاہ اس کمرے میں بند تھی نہ اسے بھوک کا احساس تھا نہ پیاس کا.....بوڑھا چوکیدار اور اس کی بیوی کھانے کا پوچھنے آتے اور دروازے پر دستک دے کر حیران و پریشان واپس چلے جاتے۔

''یہ فضا نہیں سارہ شاہ ہے' سارہ شاہ! جو کبھی محبت نہیں کر سکتی۔''

کمرے میں اک وحشت ناک سناٹا تھا' اس سناٹے میں گونجتی یہ بازگشت اور روتی سسکتی سارہ شاہ۔

''مم.....میں محبت کر سکتی ہوں مراد شاہ' بہت محبت کرتی ہوں میں آپ سے' شش.....شاید اس سے بھی زیادہ جتنی آپ مجھ سے کرتے تھے۔'' وہ بستر پر کروٹیں بدلتی' دیواروں سے لپٹتی فرش پر دوزانو بیٹھی ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہتی۔رو رو کر اس کی آنکھیں بے تحاشا سوج چکی تھیں۔لب خشک ہو چکے تھے' چہرہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔وہ وقت جو گزر چکا تھا واپس لایا جا سکتا تو سارہ شاہ وہ وقت واپس لاتی جب مراد شاہ کی بے پناہ محبت اور چاہت صرف اس کے لیے تھی' وہ ان لمحوں کو واپس لاتی جب مراد شاہ کو اس کی محبت کی طلب تھی تب وہ انہیں بتاتی کہ وہ ان سے کس قدر محبت کرتی ہے.....لیکن وہ لمحے جو گزر چکے تھے وہ واپس نہیں آ سکتے تھے۔اس نے بکھرے اور الجھے ہوئے بالوں کو چہرے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے حسرت و یاس سے سوچا تھا۔پھر جیسے یکدم وہ بری طرح چونکی تھی۔

''امان.....'' بہت دھیمی سرگوشی سی اس کے لبوں سے نکلی تھی۔وہ بے چینی سے بستر سے اٹھی۔

''اوہ میرے خدا دو دن سے میں نے امان سے بات نہیں کی وہ کس قدر پریشان ہوگا' باقی سب کو بھی تنگ کر رکھا ہوگا۔'' اس نے ہینڈ بیگ کی تلاش میں نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں تو بیگ دروازے کے قریب پڑا نظر آیا۔ اس نے بے چینی سے بیگ اٹھاتے ہوئے سیل فون نکال کر دیکھا تو چارجنگ بالکل ختم تھی۔ چارجر لگاتے ہوئے وہ فضا اور اس کی اعلیٰ ظرفی کے بارے میں سوچنے لگی۔ کیسے اس نے اپنے دل کا ٹکڑا ہمیشہ کے لیے اسے سونپ دیا تھا اور اس پر اس کی عاجزی' جس نے سارہ شاہ کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

''سارہ باجی آپ یہاں آ جائیں یا پھر وہاں رہیں' امان آپ کا بیٹا ہے' آج بھی اور کل بھی..... اگر آپ فون پر کبھی کبھار بات کروا دیں تو مجھے خوشی ہوگی لیکن اگر آپ کو یہ اچھا نہ لگے تو کوئی بات نہیں۔'' اس کا لکھا ہوا جملہ لفظ بہ لفظ سارہ کو یاد تھا۔

اسے فضا سے عجیب سی انسیت محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ تھا اس عام سی لڑکی میں جو اسے خاص' بہت خاص بناتا تھا' اسے دل کے قریب لاتا تھا' شاید اس کا بے لوث خلوص اور اس کی بے غرض محبت..... بے شک وہ اس قابل تھی کہ مراد شاہ جیسا شخص اسے اپنے دل میں بساتا۔ نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ سارہ شاہ نے دل کی گہرائیوں سے اعتراف کیا تھا۔ سارہ شاہ سے ہمیشہ محبت کی گئی تھی' محبت دینا اسے نہیں آتا تھا اور محبت لینا صرف اسے آتی ہے جو محبت دینا جانتا ہو اور محبت دینا ضرور آنا چاہیے ورنہ ایک وقت آتا ہے کہ پوری کائنات پاس ہوتے ہوئے بھی انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

گو یہ بات سارہ شاہ نے بہت دیر سے جانی تھی لیکن جب جان لی تھی تو اب وہ ایسا وقت آنے دینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ وقت جو گزر چکا تھا اسے واپس لانا ممکن نہیں تھا' اور جو کچھ کھو دیا تھا اسے پانا بھی بہت مشکل تھا لیکن یہ وقت جو اس کے ہاتھ میں تھا اسے یوں گزارنا اس کے اختیار میں تھا کہ کل اسے پچھتانا نہ پڑتا..... یہ دکھ جو اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر رہا تھا ایسا کوئی اور دکھ اٹھانا نہ پڑتا۔

امان سے بات کرنے کے لیے فون اٹھاتے ہوئے اس نے سوچا کہ اس کے بعد وہ تینوں بھابیوں اور بھائیوں سے بات کرے گی اور ان بے لوث محبتوں کا شکریہ ادا کرے گی جو وہ اب تک اس سے کرتے رہے تھے۔ ابھی اسے فضا کا شکریہ بھی ادا کرنا تھا جس نے اسے محبت کرنا سکھایا تھا۔ اور مراد شاہ! مراد شاہ سے کیا کہے وہ؟ اور کیسے؟ اور کیا وہ اس کا یقین کریں گے.....؟ کرب سے لبوں کو بھینچتے ہوئے سارہ شاہ نے سوچا اور اسے اپنے اردگرد پھیلا سناٹا کچھ اور گہرا ہوتا محسوس ہوا تھا۔

مگر اسے مراد شاہ کو ہر حال میں اپنی محبتوں کا یقین دلانا تھا اور اسے معلوم تھا' وہ مان جائیں گے کیونکہ وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور جو محبت کرتے ہیں وہ اعلیٰ ظرف بھی رکھتے ہیں۔'' یہ اس کا یقین تھا۔ وہ اک عزم سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

(ختم شد)